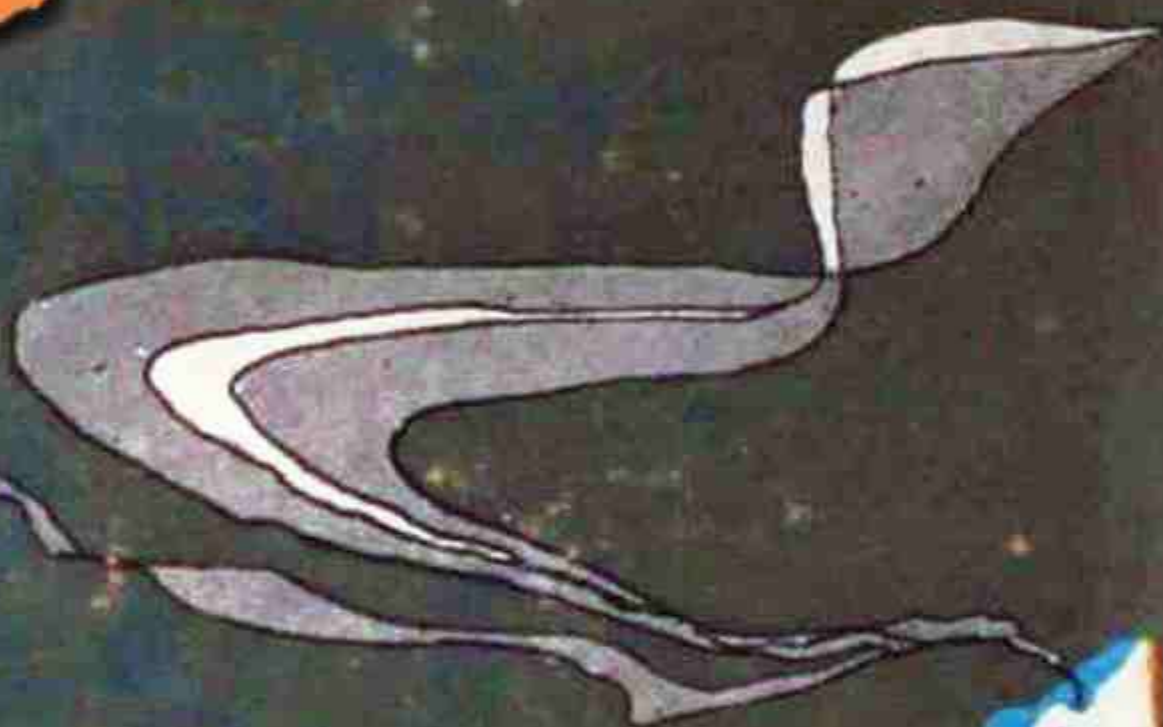
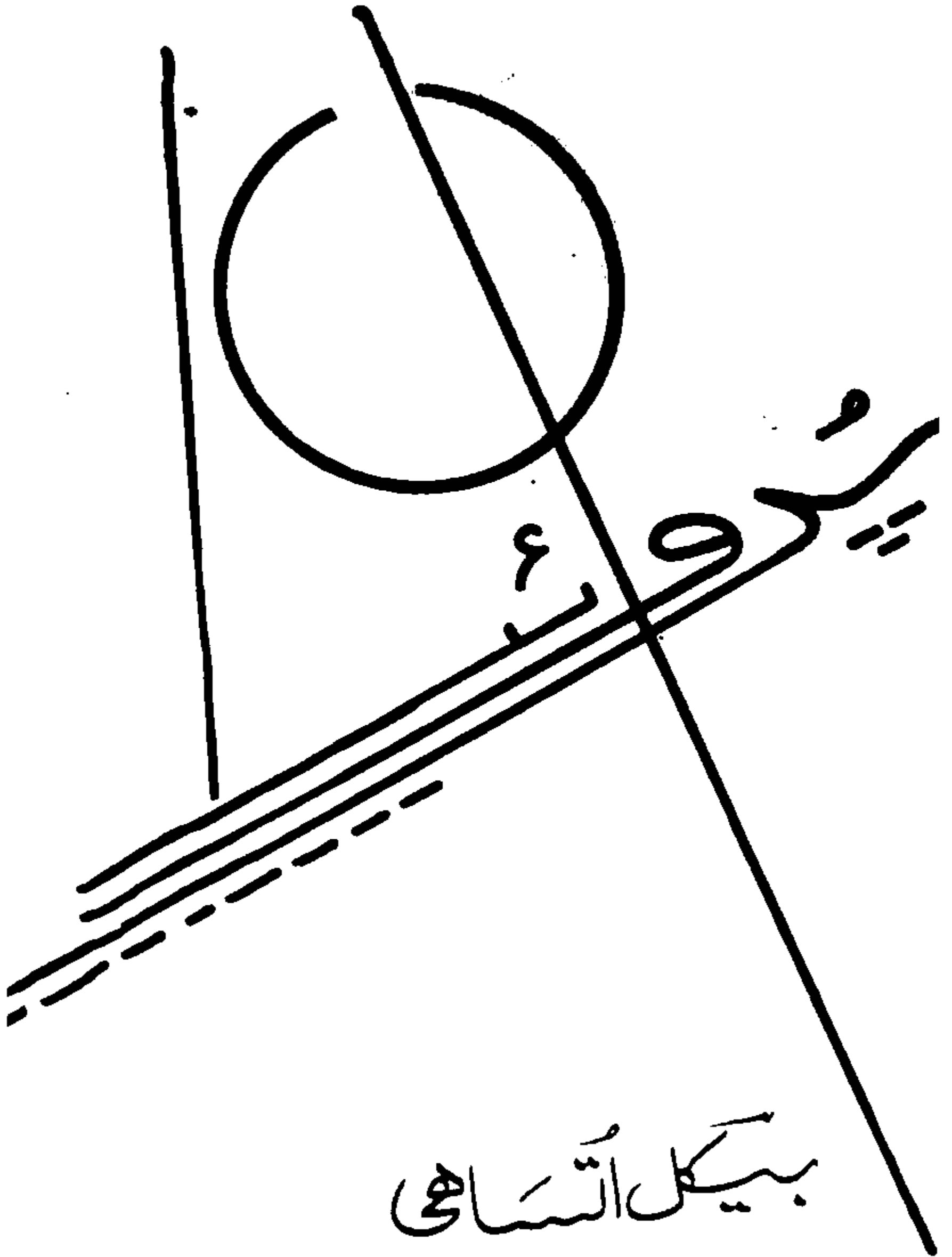


کتاب

پروگرام





جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

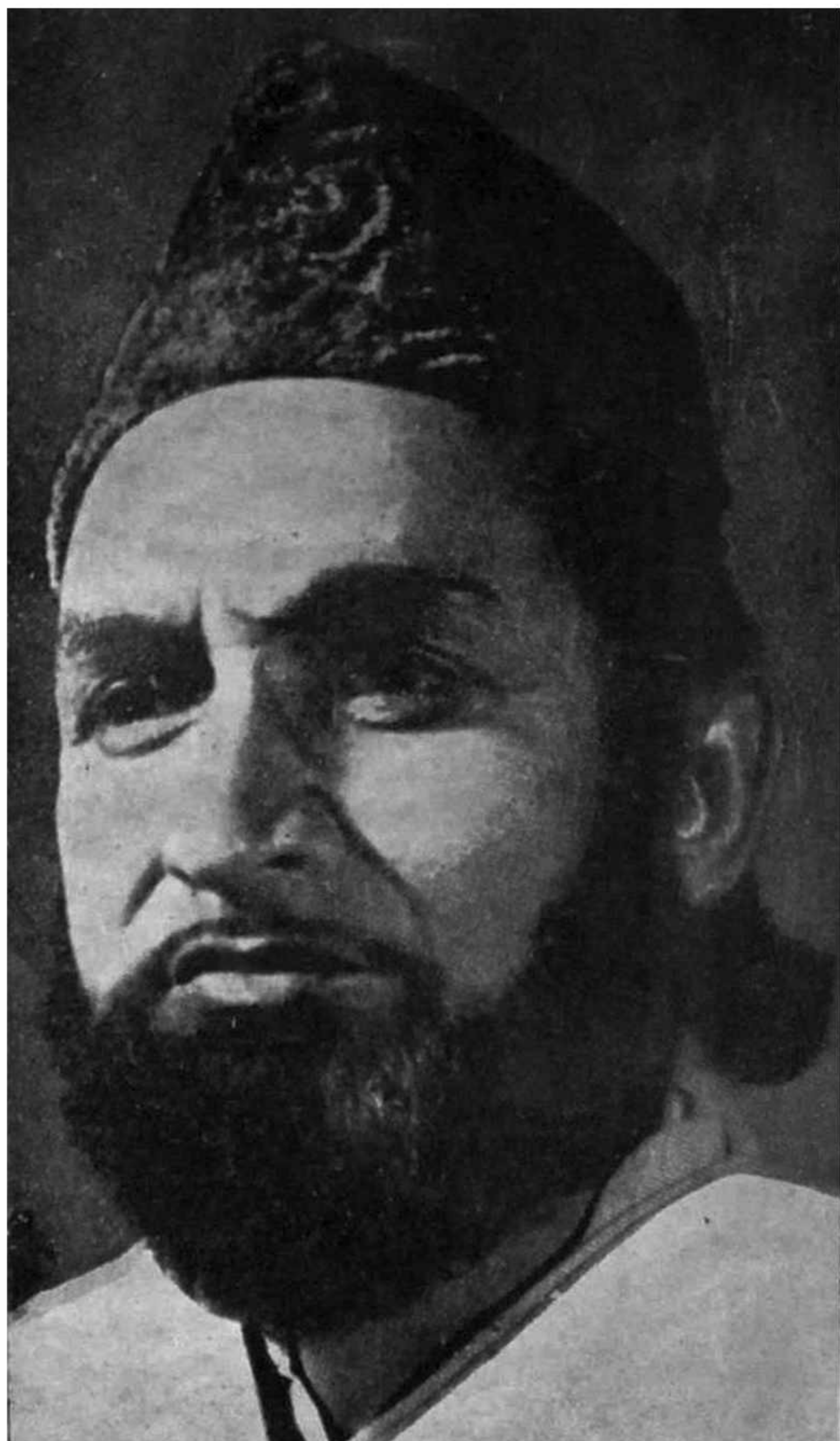
پہلی بار ۱۹۷۵ء

قیمت

پندرہ روپے پچاس پیسے

۱۵/۵۰





اُن

تاثرات

کے

نام

جنہوں نے غزل کہنے پر آمادہ کیا

پروائیالک



بیکل انیساری بلرامپوری

طالع :-

تلج آفسٹ
الہ آباد

کور پیج :-
نایاب
الہ آباد

کتابت :-
وقار صدیقی
الہ آباد

انتخاب و ترتیب

از
سلیمان عزیز
اسلم بستوی

ناتھ :-

انجمن تہذیب نوپبلیکیشنز ڈپوٹن

۲۷۲ - چک، الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳ (بھارت)

اعتزافیہ

بحث برائے بحث کی بات تو دوسری ہے۔ اس حقیقت سے کوئی بھی سنجیدہ آدمی انکار نہیں کر سکتا کہ صنفِ غزل ہر دور میں اردو شاعری کی ابرور ہی ہے اور آج بھی دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں سر بلند ہے، غزل کی اس توانائی کا راز خصوصیت کے ساتھ اس امر میں پوشیدہ ہے کہ ماہ و سال کے سفر کے ساتھ ساتھ وہ بھی ارتقار پذیر رہی ہے۔ اور اس نے اپنے کو لغوی معنوں تک محدود نہیں رکھا ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب غزل کو عورت کی یا عورت سے بات چیت تک محدود سمجھا جاتا تھا اور محض وارداتِ قلبی اور معاملاتِ حسن و عشق کی عکاسی کو اس کا منصب قرار دیا جاتا تھا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے

کہ غزل اپنے ابتدائی دور میں بھی لغات کے اُن معنوں تک محدود نہیں رہی اور اس میں حُسن و جمال کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے دیگر مسائل بھی ذخیل ہوتے گئے۔ دبستان لکھنؤ نے اس کے خارجہ جی پہلوؤں پر زور دیا اور کارِ بیکر ان شعرا نے غزل کی بندش الفاظ کے نگینے بڑھانے اور مرقع سازی سے تعبیر کیا۔ مگر رفتہ رفتہ زندگی کے مسائل میں اتنے گوشے پیدا ہوتے گئے کہ دورِ حاضر کا ذہن بھی اس سے استفادہ کرنے کا خواہش مند ہوتا گیا اور ننگہائے غزل کے اندر مزید وسعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خیریت یہ گزری کہ غزل کے پاس رموز و علامت کے طلسمی چراغ تھے جن کی روشنی میں غزل اپنی قدیم بنیادوں

پر قائم رہتے ہوئے۔ بھی جدید میلانات اور نئے خیالات سے
ہم آہنگ ہوتی گئی پھر اس کے امکانات کی سرحدیں روز بروز
وسیع سے وسیع تر ہوتی گئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ تغزل اور شگفتگی کے
ساتھ ساتھ اچھے غزل گو شعراء دورِ حاضر کے تہہ دار اُلجھے ہوئے
اور گمبھیر مسائل کو آئینہ دکھلانے لگے۔

میں بنیادی طور پر نظموں اور گیتوں کا شاعر رہا ہوں۔
نظمیں تفصیل و توضیح کی متقاضی رہی ہیں مگر میرے گیتوں سے
مجھے یہ فائدہ ضرور حاصل ہوا کہ سبک، شیریں اور نرم لب و لہجہ
میں گفتگو کرنے کا انداز حاصل ہوتا گیا، یہی شیرینی اور شگفتگی
میری غزلوں کے تخلیقی عمل کے لئے مشعلِ راہ بنی، میری تشکیلی فکر

ابں ہندوستان میں ہوئی جو غلامی کی بیڑیوں کو کاٹ چکا تھا
 مگر غلامی کی لعنتوں سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہوا تھا۔
 میرے سامنے حسن و عشق کے بنیادی جذبات کے ساتھ ساتھ
 وہ مسائل بھی تھے جن سے ہماری انسانیت مجموعی طور پر اس
 دور میں دوچار رہی ہے۔

مجھے کیا خبر کہ ادب باب نقد و نظر میری غزلوں کے بارے
 میں کیا حکم لگائیں گے، لیکن مجھے اس بات کے اظہار میں
 ذرا بھی تکلف نہیں ہے کہ میں نے حسن و عشق، ناز و نیاز
 بھر و وصال، شوق و انتظار کے روایتی مسلمات کے ساتھ
 اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ ان تقاضوں کو بھی نظر انداز

نہ کر دوں جن کا مطالبہ دورِ حاضر غزلوں سے کیا کرتا ہے۔

میں اپنی ان کاوشوں میں کہاں تک کامیاب ہوا

ہوں، اس کا فیصلہ تو ارباب ادب ہی کر سکتے ہیں لیکن

مجھے اس بات کا احساس و اعتماد ہے کہ مری انہیں غزلوں

کو ہندوستان کے عوام و خواص دونوں نے جس انداز میں

سرا ہا اور پسند کیا ہے وہ انداز کم لوگوں کے حصّے میں آیا۔

گزشتہ سطور میں میں نے اشارہ کیا ہے کہ غزل کا

فنی آہنگینہ بہت نازک ہوا کرتا ہے اور جب اس میں

کوئی غیر مانوس اور نیا لفظ یا لب و لہجہ شامل ہوتا ہے

تو غزل بڑی مشکل اور برسوں کے ریاض کے بعد اُسے

قبول کر پاتی ہے۔

میں نے جس ہندوستان میں اپنی غزلیں کہی ہیں اس
میں مجھے اس بات کا شدید احساس رہا ہے کہ اردو زبان کا
رشتہ فارسی اور عربی سے کم ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں کے
ساتھ زیادہ استوار ہوتا نظر آ رہا ہے، میں نے اپنی کچھ غزلوں میں
اس بات کی شعوری کوشش کی ہے کہ ہندی کے سبک اور
سجمل الفاظ جو ابھی تک ہماری غزلوں میں شامل نہیں ہوئے
تھے ان کو شامل کروں اور ان کی نشست و بندش
کچھ ایسی رکھوں کہ وہ عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ مل کر
جانث کو دو آنشہ بنائیں اور صوتی آہنگ کے اعتبار سے

اپنے سیاق و سباق میں اس طرح سے ہم آہنگ ہو جائیں کہ
لفظی غرابت کا احساس باقی نہ رہے، زبان و بیان پر کھٹے والے
ممکن ہے کہ اسے بدعت سے تعبیر کریں مگر میں یہ جانتا ہوں کہ بدعت
اپنے دور میں بدعت ضرور رہتی ہے لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی کبھی
مستقبل اسے اجتہاد کا درجہ عطا کر دیتا ہے۔

ان چند الفاظ کے ساتھ میں اپنی غزلوں کا یہ مجموعہ اہ باب
نقد و نظر اور ہندوستان کے عوام، دونوں کی خدمت میں یکساں
خلاص و اعتماد کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

بیگل انساہی بلرام پوری

۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء



ڈگر ڈگر انگارے بریں گلی گلی پتھر اڑ
 ٹھہرو آج بڑا جو کھم ہے تنہا کہیں نہ جاؤ
 موسم محل کا اہل جنوں بھی جانے ہیں دستور
 گلشن گلشن کھلنے والو صحرا بھی مہکاؤ
 احساسات کی دھوپ میں تپ کر یہ بھی ہوا رنگین
 پھول کا رنگ اتر جائے گا اب نہ کمرید و گھاؤ
 کیا جانے کب صبح کی کرنیں پی جائیں یہ جام
 اے شب میخانہ کی کلیو! اور ابھی مسکاؤ
 جی بھر کے دیکھا ہی نہیں ہے مجبوری کا روپ
 زسیت کے رخ سے ضبط کا آنچل اور تنک سرکاؤ
 ڈھونڈھ ہی لیں گی بیکل آنکھیں دیکھ ہی لیں گے لوگ
 دل کا چین چرٹنے والو کا ہے کہیں مسکاؤ



آج بلا عنوان سنا ہے ، افسانوں کا چرچا ہے
 گردشِ دوراں خیر، بوتری ، دیوانوں کا چرچا ہے
 جلنا جس نے جلکے سکھایا اُس کا کہیں پر نام نہیں
 لیکن یہ کیوں محفل محفل پر دانوں کا چرچا ہے
 آج نہ جانے کیا عالم ہو کیا بیتے ساتی کے ساتھ
 صبح سے میخانے کے باہر پیمانوں کا چرچا ہے
 پہلے تو چپ چاپ تماشہ دیکھ رہے تھے ساحل سے
 ڈوبنے والا ڈوب گیا ، تب طوفانوں کا چرچا ہے
 پیاس کی ماری پگلی دھرتی پی گئی اشک کے جام پہ جام
 دیرو حرم کے دروازوں پر میخانوں کا چرچا ہے
 کانپ رہے ہیں دیپ لگن کے ، ہانپ رہی ہیں اذخائیں
 جیسے ماہ و نجوم پہ بیکل انسانوں کا چرچا ہے



زلف بکھیری آج کسی نے، رند نے سمجھا کالی گھٹا ہے
 حضرت زاہد جھوم کے بولے کیا کہنا، یہ وقت عشا ہے
 مانگ میں افشاں کی صوباری، سا ہکشاں کا عالم طاری
 ادھی رات کا منظر جیسے، سارا جاگ بے ہوش پڑا ہے
 بول اٹھیں رہبر کی نگاہیں، جاگ اٹھیں خوابیدہ راہیں
 ماتھے پر یہ کیا چمکا ہے مدہم قطب ستارا سا ہے
 روشن روشن سارا عالم ہونٹ پہ پھول آنکھوں میں شبنم
 صبح گلشن رقص میں آئی، سچ پہ کوئی جاگ اٹھا ہے

سرخی عارض دہکی دہکی اوشا جیسے لہکی لہکی
 چاند پہ آج ہے پورا ہالا رخ سے حسنِ حجاب ہٹا ہے
 جنبش لب میں روپ چمن کا انگڑائی میں طور دھنک کا
 حسنِ تکلم جادوِ نغمہ ، شوخ ساتیور ، برقی بلا ہے
 راہ پہ سبزے ہیں بلہاری ہائے ستم نازک رفتاری
 دھرتی جھوم کے تلوا چومے بل کھاتا انسان چلا ہے
 کاندھے سے لو آ پخل سر کا آب رواں جھرنے سے ڈھلکا
 کاجل اُن آنکھوں میں بیکل دیکھو تو دن ڈوب رہا ہے



آج نہ جانے کیا جادو ہے یادوں کی رعنائی میں
 محفل کی محفل نکھری ہے میری شب تنہائی میں
 زلفوں کے بادل بکھرے تم جانے کس دیس بسے
 غم کی دھوپ اتر آئی ہے جیون کی انگنائی میں
 جب تک تم تھے پاس ہمارے آنکھیں بھی منہس لیتی تھیں
 اب تو یہ روتی بھی نہیں ہیں فرقت کی کٹھنائی میں
 ویسے تم معصوم بہت ہو چاہے جتنے ظلم کرو
 اور بھلے لگنے لگتے ہو تم اپنا نہٹرائی میں
 پیار میں مدرا چھلکائے ہے ممتا میں امرت برسائے
 رنگ ہلاہل کا جھلکے ہے چتون کی چٹرائی میں

یادیں تو اکسا دیتی ہیں بھولی بسری چوٹوں کو ٹر
 آنسو آگ لگا دیتے ہیں سادون کی پردائی میں
 تیری مسکانوں کا سایہ تاج محل کا روپ انوپ
 جہنا کی موجوں کی مستی ہے تیری انگڑائی میں
 دھرتی کے ذرے کی خاطر چاند کو کوئی چنتا کیوں
 پھول کنول کا کیوں کھو جائے بھنورے کی شہنائی میں
 دنیا کی تہمت سے ڈرنا پیار کا کچھ دستور نہیں
 عشق تو اور نکھر جاتا ہے تپ تپ کر رسوائی میں
 جنگل جنگل بستی بستی پیار کا چرچا، حسن کی بات
 پھر کیا بیکل تم جھانکو، ہو ہر دل کی گہرائی میں



بات بات میں کھوکھو جانا یہ کیا بھید ہے کھولو ہو
 کیا جانے کیا لوگ کہیں گے چپ نہ رہو کچھ بولو ہو
 دورا ہے کی رعنائی میں گم ہونا تو آساں ہے
 آؤ چلو ٹنگ اے ہمسفر واک رستے پر، بولو ہو
 یوں تو ساری عمر بڑی ہے یاد دہانہ انداز آنے کو
 صبح کہیں پہچان نہ جائے کج کی رات تو سولو ہو
 چلتے پھرتے دیرانوں کے شہر میں سب کچھ چمکتا ہے
 خود کو بیچ کے بیچ سڑک پر اپنی جیب ٹٹولو ہو
 نغمے ڈوبے مجھوری میں قربت کھو گئی دوری میں
 آج گلے مسکان سے لگ کر پہروں بیٹھ کے ردو ہو
 ایک طرف ہے یاد وطن کی ایک طرف ہے پیار کا روپا
 دل کو اس تشویش میں رکھ کر کیوں پردیس میں تولو ہو
 عرض کروں ہوں کیا کچھ بیتی مجھ بیکل دیوانے پر
 جانا ہے تو اپنے نین میں میرے اشک سمولو ہو



گیتوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں پھولوں سے بھرے آنگن کی طرح
 الفاظ و ترنم مچلے ہیں مسکاتے ہوئے بچپن کی طرح
 اے فصل بہاراں یہ سچ ہے کچھ قدر نہ ہو پائی تیری
 لیکن یہ بتا کوئی اور چمن دیکھا ہے مرے گلشن کی طرح
 میں کیسے لٹا ہوں ہمسفر ویہ حال نہ رستے میں پلو چھو
 ہر کام اب اپنی پرچھائیں لگتی ہے مجھے رہزن کی طرح
 خاموش ہو کیوں اے بادہ کشو کیا بات ہے آخر کچھ تو کہو
 کیا آج بھی پھر میخانے کی حالت ہے کسی زردھن کی طرح
 تاکے ہے تمہیں صبرا کی نظر ڈھونڈھے ہے تمہیں پھولوں کی ڈگر
 اے عہد بہاراں کی یادو تم دل میں بسو دھڑکن کی طرح

ہر راہ ہے اک دیوارِ فسون، ہر موڑ ہے جلوہ گاہِ سکون
 ترے شہر میں اب بھٹکے ہے جنوں، جنگل میں کسی جو گن کی طرح
 پھر دوج نے جوم لئے ابرو، بکھرائے اماوس نے گیسو
 آکاش پہ دھرتی کا جادو ہم دیکھا کئے درین کی طرح
 کروٹ کروٹ تنہائی نے پھیڑا تری یادوں کا لہرا
 پہلو پہلو سناٹا بھی کھٹکے ہے ترے کنگن کی طرح
 زلفوں کی گٹھاؤں سے پہلے کچھ روپ کی دھوپ ہی بکھرا دے
 اے جانِ غزل یہ موسم بھی، لگتا ہے تری جتن کی طرح
 کچھ چہرے شرابِ زر سے دھلے کچھ جسمِ حسد چاندی میں تلے
 کب دیکھے بیکل کون بے، مخلص بھی ہمارے فن کی طرح

لال قلعہ، دہلی، جنوری ۱۹۷۰ء



جب سے سُنا ہے اہل جنوں کا آگیا نام اسیروں میں
 اہل خرد کچھ دیکھ رہے ہیں ہاتھ کی چمند لکیروں میں
 ہنگاموں کے شہر میں کوئی دل کی بزم سجائے ہے
 میرا کی رچنائیں کھو گئیں جیسے ڈھول مجیروں میں
 گوگل گوگل عشق کی رادھا رنگ بسنت میں کھوئی ہے
 مدھون مدھون حُسن کے کاٹھا کھیلیں پھاگ اہیروں میں
 مگر مگر روپ کے کر گئے کاشی کاشی جوت کے گھاٹ
 پھر کیا ڈھونڈھیں گیان کسی کا وقت کے جھوٹے کیروں میں

موجوں کے ماتھے پہ لکھی ہے قسمت کشتی والوں کی
 عیش کی پرپاں نہج رہی ہیں ساگر پار جزیروں میں
 منزل کی یہ چاہ عجب ہے لوٹے بھی ٹٹ جائے بھی
 بھیس بدل کر ساتھ چلے ہے رہزن بھی رہگروں میں
 یوں نہ ستاروں کے جھرمٹ میں پونم روپ سجاد ہو
 گیت کا ہر اک انگ نہ جکر و لفظوں کی زنجیروں میں
 مومن نے ایمان دیا تھا، غالب جان گنوائے تھے
 ذوقِ غزل کا میر نہ ڈھونڈو آج سیاسی میروں میں
 صبح نہ جانے پھر کیا بیتے شہر کے بنگلے والوں پر
 بات کوئی گبھیر چھڑی ہے خانہ بدوش فقیروں میں
 کیا جانے کب ڈس لیں بیگل ہم بشواس کے ماروں کو
 آج کچھ ایسے دوست ملیں گے پائے ناگ ضمیروں میں



دھوپ سے چہرے پر یہ کب تک سایہ سا آنچل زموہی
 کوئی بھی رُت ہو ٹک نہیں پایا سورج پر بادل زموہی
 جھوم کے برسی کالی گھٹا بھی اور بھی بہسکی باد صبا بھی
 جب کسی تشنہ کام کے ہاتھوں ٹوٹ گئی بوتل زموہی
 میری غزل کے پیراہن میں گیت کا مکھڑا دیکھو کے بولے
 سنجیدہ مفہوم ہے لیکن لفظ بڑے چنچل زموہی
 رات اندھیری سوئی راہیں، سناٹوں کی تیز نگاہیں
 راہِ وفا کی قاتل باہنیں، ساتھ نہ میرے ہیں زموہی

گاؤں ابڑا کر اس کے ہاتھوں ویرانے کو لہکتے ہیں
 وقت نے کیسا ٹوٹا مارا ہو گئے سب پاگل زموہی
 سوکے ہونٹ اور بھیٹی آنکھیں اٹھڑوں کی سو فاتی ہیں
 پہلے آگ لگا کر ناداں پھر برسائے جس زموہی
 دپین نے سچ دھج کی ڈگر میں کون سی ایسی بات کہی ہے
 غم غم ہے سیدو در یہ کیسے بے سدھ ہے کاجل زموہی
 میخانے سے دور رہے ہیں نشتے ہیں پھر بگی چور رہے ہیں
 جالے کس نے دک لگایا ہو گئے ہم بیکل زموہی

.....



زندگی جب بھی کبھی غم کے بسیروں میں ملی
 روشنی اور بھی گمبھیر اندھیروں میں ملی
 لوگ لٹ لٹ کے بھی مانوس تباہی نہ ہوئے
 اک اسی بات کی تشویش لیٹروں میں ملی
 وہ جو زنداں میں ملا کرتی تھی بیباکی سے
 وہ ہوا آج پشیمان سی بسیروں میں ملی
 راہ جو جاتی تھی مختاروں کے محلوں کی طرف
 وہی مجبوروں کے اجڑے ہوئے ڈیروں میں ملی

پاسبانویہ نوازش یہ کرم خوب مگر
 وہ تواضع جو سرِ راہ لیٹروں میں ملی
 روزِ مٹی تھی اجل ترکِ تعلق کے طفیل
 ربط کے بعد یہ ظالم کئی پھیروں میں ملی
 بل گیا وقت کو قتلِ شب ہجراں کا سراغ
 شامِ غم جب بھی مسرت کے سویروں میں ملی
 ناگنیں لفظِ ترنم کی اسے ڈس ہی گئیں
 نغمگی جو میرے گیتوں کے پیروں میں ملی



آج اُجالا یہ کہتا تھا لگ کر گلے اندھیرے سے
 شام کی سواکت میں دیوالے جل گئے دیپ سویرے سے
 پگ پگ پر اپنی پر چھائیں سے ڈر کر گھبرائے ہیں
 منزل سے پہلے جب ہم نے پوچھی راہ لٹیرے سے
 آج کی دنیا میں کیا پوچھو یا ردناز کے پالوں کا
 مانگ کے جیون جی لیتے ہیں اس ڈیرے اُس ڈیرے سے
 کیلوں کی آنکھیں بھبکی ہیں سوکھے ہیں پھولوں کے ہونٹ
 چھوڑ کے گیت ادھورا بچھی اڑ گیا آج بسیرے سے

یا ما بھئی خود ڈوب گیا ہے چھوڑ کے اک انجان کی لاش
 یا طوفان میں چوک ہوئی کچھ بیتی رات بچھیرے سے
 کل تک تم کس اندر بچھا میں امرت رس برساتے تھے
 سوکھ گئے جب کعبیت دلوں کے پھر کیا مینہ گھیرے
 جب تک دور رہے تم ہم سے تب تک رہا تمہارا تھا
 اب ہے ہمارے گیت کا مکھڑا دیکھا تمہیں جب نیرے سے
 رستے رستے ناگ حسد کے بیکل پھین پھیلائے ہیں
 شہر خلوص کے چورسے پر چھین گئی بین سنیرے سے





کب تک ہاتھ کی ریکھاؤں میں ڈھونڈھے گا تقدیر رے جوگی
 کیا جانے کب ناگن بن کر ڈس لے کوئی لکیر رے جوگی
 دھوپ دھوپ پہروں کی حکومت چھاؤں چھاؤں زلفوں کی سیاست
 جیون کے اس دوارے پر رانجھا بن گئی ہیر رے جوگی
 نغموں کی بستی سے اکثر سناٹے بھی گزرے ہوں گے
 گویا بانی کے دور میں کیوں ہے خاموشی تقصیر رے جوگی
 کب تک یوں ہی بھیس بدل کر جرم کا روپ چھپائے گا تو
 پانی پر کب تک پائی ہے بالو کی تصویر رے جوگی
 صدیوں سے بیدار رہے ہیں اُس بستی کے رہنے والے
 جس بستی کے پورا ہے پر ٹٹتے رہے فقیر رے جوگی

کیا جانے کتنے جگ بیتے بیٹھے ہوئے ہیراگ ڈگر میں ؟
 منزل سے پہلے یہ کیسی پاؤں پڑی زنجیر رے جوگی
 ڈوب گیا کوئی وقت کا مارا یا کوئی طوفان اٹھے گا
 صبح سے آج ندی کی موجیں ہیں کتنی گمبیر رے جوگی
 تو اُس تٹ پر جوگ کے گھٹ میں، میں اس چھو پر سوگ کپٹ میں
 میگ میگ کی یہ اُن مٹ دوری کیسے رہے اسیر رے جوگی
 تمہری تمہری عشق کی موجیں ستھرا ستھرا حسن کا ساحل
 دیکھنا ہے تو سنگ ہمارے چل جھنا کے تیر رہے جوگی
 تیکھے بان ، انوٹھے چتوں ، بیکل بیناں ، پیا سے درپن
 عمر کے ان چنچل ہاتھوں میں زہر بھی تھا کبیر رے جوگی

”دُورِھے“

ندریاں بہیں ہواؤں میں پانی تھوڑے دھول
شعلے اُپجیں خاک سے ، آگ اُگائے پھول

نشر چاہے پھول سے ، برف سے مانگے خون
دھوپ کھلائے چاند کو ، اندھے کا قانون

امرت رس کے بین پر زہر کے نغمے گاؤ
مرہم سے مسکان کے زخموں کو اُکساؤ

”دُھ“

جھینپے جھینپے نین کی شوخ شوخ مسکان
چغتائی کی فکر میں غالب کا دیوان

ناگن جیسی زلف ہے مرمر جیسا روپ
جیٹھ کے یہ کجھراہے بادل، یہ سادن کی دھوپ

بیگل جی کس فکر میں بیٹھے ہو من مار
کاغذ کی اک اوٹ ہے زنداں کی دیوار



اٹھ گئے دورِ جام سے پہلے
تشنہ لب فیضِ عام سے پہلے

ابتدا کر رہا ہوں جینے کی
اے اجل تیرے نام سے پہلے

زندگی تلخ کام تھی کتنی
رقصِ مینا و جام سے پہلے

ہر نظامِ حیات باطل تھا
میکدے کے نظام سے پہلے

حشر کا تھا کسے یقین اتنا
حسنِ محشرِ خرام سے پہلے

اتنی رنگیں تھی کب غزل بیکل
اصغر خوش کلام سے پہلے

۶۱۹۴۸

۱۔ حضرت اصغر مرحوم گوندوی سے مراد ہے۔



فصل بہار جھوٹے، حسین گلستاں بنے
 یہ مدعا نہیں کہ مرا آشیاں بنے
 پھولوں کا رنگ بڑھ کے شراروں نے لے لیا
 جب سے چمن کے اہلِ خرد باغیاں بنے
 ذرے کبھی جو گم تھے مری گردِ راہ میں
 یہ وقت ہے کہ آج وہی کہکشاں بنے
 رکھنی ہے گمراہی میں بھی اب رہنما کی لاج
 سب مل کے یوں چلو کہ کوئی کارواں بنے

وہ بے زباں ہوا ہے زمانے کے سامنے
 جب بھی حضور آپ کسی کی زباں بنے
 احساسِ بندگی مرا اتنا بلند ہے
 سر جس جگہ جھکا دوں وہیں آستان بنے
 سب چھیڑ کے تجھے تری محفل سے اٹھ گئے
 اک ہم ہی رہ گئے جو ترا امتحاں بنے
 بیکل بیانِ حسن و محبت بجا مگر
 خود اس طرح مٹو کہ کوئی داستان بنے

فروری ۱۹۵۰ء



اس نہ آئے جب طوفان
 موجوں سے ساحل پہچان
 روک سکیں کب آنکھیں اشک
 دھڑ چلے آخر مہمان
 پھر وہی اندازِ فریب
 پھر وہی لٹنے کے سامان
 خود پیاسی اور غیر کو جام
 ایسی نظر پر دل قربان
 حسن کی بزم میں دیدہ و دل
 اک مانوس اور اک انجان
 تیرِ نظر کچھ دیکھ کے چل
 اک ہے دل وہ بھی نادان
 پھر وہی پریش کا انداز
 پھر وہی بیکل پر احسان



دستگی عشق کا ساماں نہیں رہا
 اب دل میں تیرے تیر کا پیکاں نہیں رہا
 دست جنوں نے ایسی اڑائی ہیں دھجیاں
 وحشی کے تن پہ تارِ گریباں نہیں رہا
 نزدیک آتی جاتی ہے کیوں منزلِ مراد
 کیا جستجو کا جوشِ فراواں نہیں رہا
 یاد آگئیں جو صن کی رنگیں ادائیاں
 دل مائل بہارِ گلستاں نہیں رہا
 فرطِ خلش سے دل ہی بنا تیر دل نشین
 اب دل میں تیرے تیر کا احساں نہیں رہا
 پیچیدہ تر ہیں اصل میں اس دل کی الجھنیں
 جو دل اسیرِ کاملِ پیچاں نہیں رہا
 گلزارِ جس سے آتشِ نمرود ہو بیکل
 شعلہ دلوں میں اب وہ فردزاں نہیں رہا



محبت اک زبانِ بے زباں معلوم ہوتی ہے

دل مضطر کی خاموشی فغاں معلوم ہوتی ہے

دنگاہِ دوست جب سے ہو گئی نامہریاں مجھ پر

بڑی شکل میں جانِ ناتواں معلوم ہوتی ہے

کسی دن دیکھنا خونِ تمنا رنگ لائے گا

جی بے رنگ اپنی داستان معلوم ہوتی ہے

نپوچھو میرے دل سے رفعتِ شوقِ جہیں سائی

زمینِ کوئے جانانِ آسماں معلوم ہوتی ہے

کسی کے عشق میں اس درجہ شوقِ جاں نثاری ہے

کہ ہر اک سانس عمرِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

اسی جا پر بناتا ہوں میں جا کر آرشیاں اپنا

جہاں بھی لرزشِ برقی تپاں معلوم ہوتی ہے

گلِ باغِ تمنا کھل ہی جائے گا ترا بیگل

نچھ جب آتشِ غم گلستاں معلوم ہوتی ہے



مری ہر سانس رو دادِ جوانی بنتی جاتی ہے
 خدا کے ستم سے زندگانی بنتی جاتی ہے
 وہ تھا آغازِ الفت جب کہانی بھی حقیقت تھی
 مگر اب تو حقیقت بھی کہانی بنتی جاتی ہے
 نگاہِ ناز میں ان کی حیات و موت مضمحل ہے
 اسی اک کشمکش سے زندگانی بنتی جاتی ہے
 ثبوت بے ثبانی ہر نفس دیتا ہے وحشت میں
 شبِ فرقت بھی در پردہ سہانی بنتی جاتی ہے
 تصور میں تری ہر اک ادا میرے لئے ساقی
 حقیقت میں شرابِ ارغوانی بنتی جاتی ہے
 حضورِ دوست لب کھلتے نہیں بیکل مگر پھر بھی
 خموشی خود زبانِ بے زبانی بنتی جاتی ہے



درد کا غمناں لٹ نہ جائے
 اک دل ناتواں لٹ نہ جائے
 بھیلیوں کا جہاں لٹ نہ جائے
 یہ مرا آشتیاں لٹ نہ جائے
 ہو نہ ہو آج وہ مسکرا دیں
 پھر غم جاوداں لٹ نہ جائے
 ان کے دامن کو منزل نہ سمجھو
 آنسوؤں کا رواں لٹ نہ جائے
 شمع کی تھر تھرانے لگی کو
 عاشق بے زباں لٹ نہ جائے
 کیوں نہ دیں جان جل کر پتنگے
 بزم آہ و فغاں لٹ نہ جائے
 آج پھر وہاں ہر کچھ خفا ہے
 آج پھر کارواں لٹ نہ جائے
 لوٹ کر میری توبہ کو بیسکل
 ساقی مہرباں لٹ نہ جائے



چھڑا ہے دل تے غم کا فسانہ ہزار بار
 کروٹ بدل چکا ہے زمانہ ہزار بار
 اے دل سکون و ضبط کی منزل سے کیوں گریز
 تو بن چکا ہے کس کا نشانہ ہزار بار
 بڑھتا رہے گا مشقِ تصور کا حوصلہ
 آیا کرے گا ایسا زمانہ ہزار بار
 تو بہ تڑپ تڑپ گئی دیکھا کئے مگر
 ساقی کا چشمِ ناز جھکانا ہزار بار
 گرتی رہیں گی میرے نشین پہ بجلیاں
 پاتا رہوں گا پھر بھی ٹھکانا ہزار بار
 جانے کو جا رہا ہوں ترے در سے بے نصیب
 آؤں گا ایک غم کا بہانا ہزار بار
 بیکل خدا گواہ یہ راتوں کی بیگلی
 بیٹے گا یوں ہی دن بھی سہانا ہزار بار

آج بھر کے نکلے وہ گھر سے

دیکھو بادل کہاں آج بھر سے

زندگی وہ سنبھل نہ سکے گی

مگر مٹی جو تمہاری نظر سے

جل ہی جائے نہ دامن تمہارا

میت لگاؤ میری چشم تر سے

راہگیر و بدل ڈالو راہیں

راہزن مل گئے راہبر سے

میں ہر اک حال میں آپکا ہوں

آپ دیکھیں مجھے جس نظر سے

رُخ پہ لہرائے گیسو سنور کے

کوئی کہے یہ شام و سحر سے

پھر ہوئیں دھڑکنیں تیز دل کی

پھر وہ گزرے ہیں شاید دھر سے

بجلیوں کی تو افق میں بیکل

آشیانہ بناؤ شر سے

۱۹۴۷ء



ہوش سے ہو گئے جو بیگانے

وہ چلے میرے دل کو سمجھانے

کیا ہوا انجام یہ خدا جانے

ہیں ابھی رقص میں تو پردے

ضبط تشنہ بی تو کام آیا

خود گلے مل رہے ہیں پیما نے

یہ بھی سازش ہے کم رنگا ہی کی

لٹتے لٹتے بچے ہیں میخانے

تھیں جنوں کی نواز شیں ورنہ

دور ہونے خرد سے فرزانے

جب بھی تار بکیوں نے گھیرا ہے

جلوے آئے ہیں تیرے بہلانے

وہ ہو آئے تو تھم گئے آنسو

اک حقیقت ہزار افسانے

آج ماحول ڈگر کا تا ہے

آج کچھ ہوش میں ہیں دیوانے

جب جنوں نے گرا دیا بسیکل

گود میں لے لئے ہیں دیر لے

۱۹۴۷ء

وہ بھی صورت کسی رونے سے اتر جاتی ہے
 آنسوؤں سے وہی دھل دھل کے نگر جاتی ہے
 ان کے چہرے پہ اگر زلف بکھر جاتی ہے
 چاندنی اور بھی بدلی میں سنور جاتی ہے
 کیا خبر تھ کو، مجھے دیکھ کے ہنسنے والے
 زندگی یوں بھی دیوانے کی گزر جاتی ہے
 جرات عرض تمنا ہے بڑی گستاخی
 اک یہی فکر تو بیمار سا کر جاتی ہے
 رنگ دنیا سے الگ ہٹ کے تری یاد کے ساتھ
 ایک تصویر مرے دل میں اتر جاتی ہے
 چل کے اب تیرے اشاروں پہ ذرا دیکھوں تو
 مجھ کو تقدیر مری لے کے کدھر جاتی ہے
 قدم ناز سے ٹھکرا کے یہی کہتے ہیں
 سراٹھالے کہ مری عظمت در جاتی ہے
 اس جگہ پیار کی منزل ہے کوئی ان سے کہے
 جس جگہ گردشِ ایام ٹھہر جاتی ہے
 سہی سہی کسی یاد سے پہلے بیکل
 درد اٹھتا ہے ہر اک چوٹ ابھر جاتی ہے



پھٹ گئے بادل نکھری شام جل گئے دیک پھلکے جام
 ڈوب گئی جب نبض حیات ان کا تب آیا پیغام
 بڑھتی ہے دل کی تکلیف ملتا ہے جتنا آرام
 حسن کی خود بینی ہے ناز عشق کی خودداری آلام
 ساری بلائیں ہم کو قبول آپ پہ کیوں آئے الزام
 عشق میں وہ ہو ہار کہ جیت درد بہ ہر پہلو انعام
 اور ابھی نکھرے گا عشق اور ابھی کر لو بدنام

نقش ہیں کتنے دل پر لوگ

بھول گئے بیکل کا نام



ہجر کی شب، ستاروں کو نیند آگئی
 ہائے میرے بہاروں کو نیند آگئی
 جن کے دم سے تھا ہنگامہ آرزو
 ان محبت کے ماروں کو نیند آگئی
 میں نے پھیڑی ہی تھی داستانِ الم
 گلستاں میں بہاروں کو نیند آگئی
 یاس نے جانے چپکے سے کیا کہدیا
 کیوں ترے بیقراروں کو نیند آگئی

ان کا حسنِ نظرِ الاماں الاماں
 کتنے رنگیں نظاروں کو نیند آگئی
 سحر تھا نغمہ بلبِ خوش نوا
 پھول تو پھول خاروں کو نیند آگئی
 آج ہی ملتفت تھی وہ چشمِ کرم
 آج ہی غم کے ماروں کو نیند آگئی
 سن کے بیکل سے پُر کیف درنگیں غزل
 آسماں پر ستاروں کو نیند آگئی



جہاں جہاں مری تنہائیوں نے پیار کیا
 وہاں وہاں تری یادوں نے ہو گوار کیا
 یہ کیا کیا مرے اشکوں کو پونچھ کر اے دوست
 خود اپنے دامن سادہ کو داغدار کیا
 فریب کھانے سے پہلے فریب کھانے کے بعد
 کہاں کہاں نہ زمانے کا اعتبار کیا
 تھا جن پہ ناز گلوں کو انھیں بہاروں نے
 سحر کے آتے ہی دامن کو تار تار کیا
 قدم قدم پہ مری بے بسی ہی ساتھ رہی
 جو راستہ بھی ترے غم میں اختیار کیا
 ترے جمال کی برکھانہ جس کو بیخ سکی
 مرے لہونے اُسے حاصل بہار کیا
 مرے جنوں کی مہک نے اداس لمحوں میں
 فضا ئے ہوش و خرد کو بھی خوشگوار کیا
 جو مسکراتے تھے بیکل ہمارے رونے پر
 کسی کی یاد نے ان کو بھی اشکبار کیا



اے ہم نفس نہ چھیڑا بھی دلِ خموش ہے
 نعماتِ کم ہیں رونقِ محفلِ خموش ہے
 شاید کوئی لٹا ہے غریبِ لوطن یہیں
 آغوشِ اضطراب میں منزلِ خموش ہے
 اٹھے گا آج پھر کوئی طوفانِ نیا
 دھارے لڑ رہے ہیں تو ساحلِ خموش ہے
 چلمن کسی نے روئے شور پہ ڈال لی
 کڑیں بھرت گئیں مدِ کاملِ خموش ہے
 احساسِ خود فریبی ہی احساسِ جرم ہے
 دامنِ کا داغ دیکھ کے قاتلِ خموش ہے
 بیگلِ ابھی لبوں پہ ترے تھا انھیں کا گیت
 اب کیا ہوا کہ ان کے مقابلِ خموش ہے



رنگِ میخاز گلشن میں جھلکا

ہنکرتِ گل اڑی، جام چھلکا

رقص کرتا ہے احساسِ ماضی

درد اٹھتا ہے جب ہلکا ہلکا

یہ تمازت زمانے کی توبہ

روپ سنولا گیا ہے غزل کا

ٹھہریئے، سانس آئے نہ آئے

کیا بھروسہ یہاں ایک پل کا

چاند ہے چاندنی ہی نہیں ہے

یوں فضاؤں پہ چھایا دھند لکا

ایک بیکل کی کشتی ڈبو کر

نام روشن ہوا تو اجل کا



جب انہیں اپنی جفاؤں پر ندامت ہو گئی
 میرے غم کی ہر کہانی اک حقیقت ہو گئی
 کھوئے کھوئے سے نظر آتے ہیں کیوں وہ اندنوں
 کیا کسی بے درد سے اُن کو بھی الفت ہو گئی
 پھر کسی نے رُخ سے دانستہ اٹھا دی ہے نقاب
 خیر ہو دنیاے دل کی پھر قیامت ہو گئی
 اور بھی زلف پریشاں کو پریشاں کر دیا
 مجھ سے کیا باد صبا کو بھی رقابت ہو گئی
 لو چلو یوں ہی سہی توبہ کئے لیتا ہوں آج
 میندہ کو کل اگر میری ضرورت ہو گئی
 چھپر کر کلیوں کو بیکل اور خود ہی رو پڑی
 قلب شبنم میں بھی پیدا کیا حرارت ہو گئی



یوں تو لاکھوں دیئے جلائے ہیں
پھر بھی تارکیوں کے سائے ہیں

چشم ساقی کی مستیاں توبہ

بے پیئے پاؤں لڑکھڑائے ہیں

آج توہین میکشی ہوگی مٹ

شیخ بھی میکدے میں آئے ہیں

جلوہ محل ، ضیائے ماہ و نجوم

سب فریبِ نظر کے سائے ہیں

درد جیسے کوئی امانت ہے

دل میں اس طرح ہم چھپائے ہیں

میری توبہ کی خیر ہو . سیکل

آج ابر بہار چھائے ہیں



بچے نہ دل جو سر زلف مشک فام آئے
 خدا کرے نہ کوئی مرغ زیر دام آئے
 تیری شبیر ہو جس دل نقش، دل ہے وہی
 وہی زباں ہے زباں جس پہ تیرا نام آئے
 ڈیو دی بڑھ کے ندامت نے فرد عصیاں کی
 خود اپنے اشک بڑے وقت پر نہ کام آئے
 کچھ ان کے رخ پہ بڑھی اُری ہیں یوں زلفیں
 کہ جیسے رنگ سحر جائے رنگِ شام آئے
 رُکے فلک پہ نہ عرش بریں پہ شامِ فراق
 اگرچہ تالوں کو ایسے کئی مقام آئے
 بجائے مئے تجھے دینا تھا نہ ہر اے ساتی
 عدد کے ہاتھ سے محفل میں جھکو جام آئے
 نویدِ خلد ہو مژدہ ہو بارغِ جنت کا
 ترے جواب میں بیکل اگر سلام آئے



بوششِ پریوں بھی تجھے رحمتِ یزدان دیکھا
 ہر گنہگار کو فردوسِ بدایاں دیکھا
 کیا کہوں بحرِ غمِ دل کے طلاطم کا سماں
 ایک طوفان کا عالم سرِ مژگاں دیکھا
 بعضِ کونین بھی رک جاتی ہے جس منزل پر
 تیرے جلووں کو وہاں اے غمِ جاناں دیکھا
 تیر گنجِ شبِ ہجراں کے مقابل اے دوست
 بزمِ محرومیِ قسمت میں چراغاں دیکھا
 وہ مسرت ہو کہ غم، لطفِ غلش ہے مقصود
 دل کو ہر حال میں شائستہ حرماں دیکھا
 آج کیا گزرے زمانے پہ خدا خیر کرے
 گردشِ وقت کو بھی آج پریشاں دیکھا
 مجھ کو تسکین کی امید تھی جن سے بسکل
 رنگِ غم ان کے بھی چہرے سے نمایاں دیکھا



عشق اگر مبہم ہو جائے حسن کا چرچا کم ہو جائے
 دیوانے کی آنکھ لگی ہے شمع ذرا مدہم ہو جائے
 کون ستاروں کو دیکھے گا دوج اگر پونم ہو جائے
 مجھ کو دیکھ کے ہنسنے والے یہ جو ترا عالم ہو جائے
 اور بھی شوقِ حسن بڑھادے درد جو میرا کم ہو جائے
 ہونہ سکے گا جشنِ بہاراں شعلہ اگر شبنم ہو جائے
 ہوگا وہیں احساسِ تبسم آنکھ جہاں پر نم ہو جائے
 میرا مقدر توڑنے والے زلف تری برہم ہو جائے

جس کارن جیون ہے بیکل
 ہائے وہ درد نہ کم ہو جائے



سہانی راتوں کی دلکشی کو فریب کار سحر نے لوٹا
 مری امیدوں کی زندگی کو خموشی و ہگڈر نے لوٹا
 عبث یہ تنہمت ہے راہزن پر غلطیہ شکوہ ہے فاصلے کا
 کہ دہوؤں کو قریب منزل، قرینہ راہبر نے لوٹا
 یہ بات ممکن بھی ہو سکے گی کہ رہنما کارواں کو لوٹے
 مجھے تو ہر قدم پہ رک کر رفاقت ہمسفر نے لوٹا
 متاع الفت کو راز ہستی بنا کے دل میں چھپایا جسکو
 اداس راہوں پہ چلتے چلتے اک اجنبی کی نظر نے لوٹا

مرا نشیمنِ قفس میں لاکر جلا دے کوئی تو غم نہیں ہے
 مگر یہ غم ہے چمن میں رہ کر نوازشِ بالِ پر نے لوٹا
 تباہیاں مسکرا رہی ہیں اداسیاں گنگنا رہی ہیں ۶
 کہ عصرِ حاضر کے ذہن و دل کو کشاکشِ خیر و شر نے لوٹا
 درازِ عمرِ جہانِ غم ہوا لم کی کوئی گھڑی نہ کم ہو
 میں مطمئن ہوں کہ مجھ کو پہلے سکونِ سوزِ جگر نے لوٹا
 خودی کی دنیا چل رہی تھی سکون میں کروٹ بدل ہی گئی
 بھلا کرے منتظر کا بیکل تصویرِ منتظر نے لوٹا

اکتوبر ۱۹۷۹ء



فصل گل کب لٹی ، نہیں معلوم
 ہم بھٹکتے رہے اندھیرے میں
 کب وہ گزرے قریب سے دل کے
 دروجب جب اٹھا ، ہوا محسوس
 بے بسی جس کی زیت ہو ، اسکو
 ناز سجدوں پہ ہے ہمیں لیکن
 اپنی حالت پہ تیرے وحشی کو
 ہوش آیا تو میسکہ نہ رہا
 میری جانب وہ دیکھ کر بولے

کب بہار آئی تھی ، نہیں معلوم
 روشنی کب ہوئی ، نہیں معلوم
 نیند کب آگئی ، نہیں معلوم
 چوٹ کب کب لگی ، نہیں معلوم
 زیت کی بے بسی ، نہیں معلوم
 نازش بسندگی ، نہیں معلوم
 کیوں ہنسی آگئی ، نہیں معلوم
 ہائے کس وقت پنی ، نہیں معلوم
 ہے کوئی اجنبی ، نہیں معلوم

دورِ حاضر کی بزم میں بیٹکل
 کون ہے آدمی ، نہیں معلوم



محفل میں تجلی چھا جائے ہر ایک نظر پروانہ بنے
 جلوؤں میں نظر گم ہو جائے یوں شمع ترا افسانہ بنے
 اے فصل بہاراں اب کہ ذرا کچھ ایسے سلیقہ سے آنا
 ہر غنچہ صراحی بن جائے جو پھول کھلے پیمانہ بنے
 جب اُن کو بنایا تھا اپنا تو اور ہی حالت تھی دل کی
 اب اور ہی عالم ہے دل کا جس وقت سے وہ بیگانہ بنے
 کچھ لطف جنوں حاصل نہ ہوا کچھ غم میں سکون شامل نہ ہوا
 اے دوست بہاروں میں اکثر دانستہ بھی ہم دیوانہ بنے
 اے کالی گھٹاؤ تم کو قسم مجبور کی تشنہ کامی کی
 کچھ اب کے ذرا ایسا برسو ہر گام پہ اک مہینا نہ بنے
 تنہائی شریکِ غم ہو جہاں بیکل وہ اپنا عالم ہے
 ہم عمر بسر کر لیں گے وہاں صحرا بھی اگر کا شانہ بنے



دیکھیں گی ہم زعم ترا تو نے کیا ہم کو جانا ہے
 اے گردشِ دوراں شہرِ ذرا ہاتھوں میں باقی پیمانہ ہے
 پی کر جسے ہستی جھوم اٹھے سن کر جسے شک چھلکاٹھے
 بادہ دی بادہ ہے اے دل افسانہ دی افسانہ ہے
 تفریق سے پاکتِ ذہن یہاں اک دل میں یہاں ہر چوچکا
 یہ دیرِ حرم کی بزم نہیں واعظیہ مرا میخانہ ہے
 احساس تو ہے انکو بھی مگر کچھ اور ہی ہے اندازِ نظر
 کچھ ذکرِ جمالِ شمع بھی ہے کچھ فکرِ غم پر دانا ہے
 اس سودِ زیاں کی بستی میں اس دہم و گماں کی دنیا
 فرزانوں سے پوچھو کیا گزری دیوانہ تو پھر دیوانا ہے
 ہم اہلِ یقین کا مسلک تو ان سے ہے جدا جو کہتے ہیں
 عرفان ہے اک زعمِ باطل پیمانِ ازل افسانہ ہے
 اس کارِ گرِ کیف و کم میں اس شوق و طلب کے عالم میں
 فرزانہ جو ہے دیوانہ ہے دیوانہ جو ہے فرزانہ ہے
 غمروں کی شکایت کیوں کیجئے اربابِ جفا کا شکوہ کیا
 یہ منزلِ عشق ہے اے بیکل اپنا بھی یہاں بیگانہ ہے



نہ خود ہی رہنا ہے نہ جنوں ہی راہر ہے
 میں خلوصِ غم کے صدقے یہی میرا ہم سفر ہے
 جسے کہہ رہی ہے دنیا، ہے گلوں پہ اشکِ شبنم
 ہے پسینہ برگِ گل کا یہ خیال دیدہ ور ہے
 میں رہائی کیا کروں گا مرا آشتیاں جلا دو
 کہ بہار کی تمنا بھی فریبِ بال و پر ہے
 نہ کشائشِ تمنا نہ وہ جادہٗ محبت
 نہ وہ چشمِ نازا ہے نہ فسوںِ عشوہ گر ہے

۱۹۵۳ء

طراگئی ہے برقِ خود اپنے شر کے ساتھ
 تنگے سمٹ گئے ہیں مرے بالِ پر کے ساتھ
 گلشن میں آج صبح قیامت ہے جلوہ بار
 یہ کون آگیا ہے نسیمِ سحر کے ساتھ
 اس احتیاطِ دید نے اسکو بھی کھو دیا
 وداک سکوں سا تھا جو فریبِ نظر کے ساتھ
 تکلیفِ بجدہ دردیگر نہ دے اُسے
 منسوب ہو چکا جو ترے سنگِ در کے ساتھ
 بزمِ تجلیات میں کوئی کمی نہیں
 دل ہی فریب کھا تا رہا ہے نظر کے ساتھ
 بیگل کمالِ رتبے پر داز دیکھے
 کچھ دور جا سکا : فرشتہ بشر کے ساتھ



لوشع کی تھرائی، پروانے چل اٹھے
 اس جنبشِ جلوہ سے دیوانے چل اٹھے
 رعنائی و حشت پر ویرانے چل اٹھے
 دیوانے تو دیوانے فرزانے چل اٹھے
 ساقی کی نگاہوں کی تاثیر معاذ اللہ
 دور آنے سے پہلے ہی پیمانے چل اٹھے
 اس جانِ تمنا کی پریش بھی قیامت تھی
 ہونٹوں پہ محبت کے افسانے چل اٹھے
 ہر شعلہ رنگیں گو عنوانِ تباہی تھا
 انجام سے ناواقف پروانے چل اٹھے
 بیکل رہ الفت میں غیروں کی شکایت کیا
 اپنوں نے کیا وہ کچھ، بیگانے چل اٹھے

آگے تلک شورشِ دل سے
کچھ توقع ہے دستِ قاتل سے

جتنی منزل قریب آئی ہے
دور ہوتے گئے ہیں منزل سے
بیخودی جنوںِ شوق نہ پوچھ
قیس پٹا ہے گردِ محفل سے

ہائے وہ بد نصیب جن کے لئے
اشک ٹپکے ہیں چشمِ ساحل سے
کچھ جو بھی تو سعیِ ضبطِ اُلم
دل بہلتا ہے کتنی مشکل سے

اب وہ ہنگامہ نشاطِ نہیں
اٹھ گیا کون تیری محفل سے
ردائے تاباں کی یادیں بیکل
بات ہوتی ہے ماہِ کامل سے

دامن کا ہوش اور جگر کی خبر نہیں
 کم یہ بھی فیضِ موسمِ دیوانہ گر نہیں
 فصلِ جنوں وہی ہے وہی کاوشِ جنوں
 پہلی سی ہاں وہ رونقِ دیوار و در نہیں
 انجامِ عشق کی جو خبر ہو تو کچھ کہوں
 آغاز ہی میں جبکہ بیاباں ہے گھر نہیں
 تصویر صرف ایک ہے نظروں کے سامنے
 میں قید ہوں جہاں کوئی دیوار و در نہیں
 آئینہ دیکھ کر نہ تبسم سے کھیلے
 آئینہ ہے حضور یہ آئینہ گر نہیں

اشکِ جمالِ حسن کو شبِ بنم کہو مگر
 ہر پھول کی جہیں تو پسینے سے تر نہیں
 کیا پوچھتے ہیں چاکِ گریباں کیوں مرا
 کیا آپ کی نگاہ میرے حال پر نہیں
 پیدا کیا جوابِ رُخ لا جواب کا
 کیا یہ کمالِ صنعتِ آئینہ گر نہیں
 بیکل ان آنسوؤں کی نہ قیمت نہ قدر
 قطرے ہیں اشک کے کوئی لعل و گہر نہیں

۱۹۵۳ء

ترے غم کی حقیقت کو بھی افسانہ سمجھ بیٹھے
 ستم ہے۔ لو لہوس اپنے کو بیگانہ سمجھ بیٹھے
 محبت میں زمانے سے جدا ہے راستہ اپنا
 تعجب کیا جو اہل ہوش دیوانہ سمجھ بیٹھے
 زکاہیں آشنائے جلوہ نیرنگ ہیں اپنی
 کہ ہر تصویر کو تصویر جانا نہ سمجھ بیٹھے
 ہر اک گوشہ میں ہر انداز کی تصویر ہے ان کی
 مرے دل کو وہ اپنا آئینہ خانہ سمجھ بیٹھے
 بیاباں تنگ تھا دار فنگانِ شوق کو لیکن
 خوشاد حشت کے گلشن کو بھی دیوانہ سمجھ بیٹھے
 جنوں نے جن کے بڑھ کے ابرو رکھ لی گریباں کی
 قیامت ہے انھیں بھی آپ دیوانہ سمجھ بیٹھے
 کوئی دیکھے تو سرمستانِ فطرت کی سیہ مستی
 ہجومِ سرخوشی میں گل کو پیما نہ سمجھ بیٹھے
 تصور کی یہ بزمِ آرائیوں کا فیض ہے بیکل
 کہ ہم خلوت کہہ کو بزمِ جانا نہ سمجھ بیٹھے

کچھ تو ہی بتا اب کیا ہو گا اے ذوقِ سفرِ دل بیٹھے ہیں
 گھبرا کے فریبِ رہبر سے داماندہ منزل بیٹھے ہیں
 یہ حسنِ تصور ہے میرا یا ان کی فسوں کاری کا اثر
 محسوس ہوا یوں بھی اکثر جیسے وہ مقابل بیٹھے ہیں
 اے شورشِ طوفاں ناز نہ کر ہم وہ پروردہ طوفاں ہیں
 ساحل کے قریب بھی رہ کر جو بیگانہ ساحل بیٹھے ہیں
 واقف ہیں ماںِ عشق سے ہم ، آگاہ ماںِ دل ہیں مگر
 آغاز کی لذت کیا کہئے انجام سے غافل بیٹھے ہیں
 ہم جلوہ حسن کے ماروں کا وہ عالمِ حیرت ہے بیکل
 محفل میں کسی کی رہ کر بھی بیگانہ محفل بیٹھے ہیں

جو تم نے دولت احساس دی ہے وہ بھی تم لے لو
 یہی لے دیکے کیفیت زندگی ہے وہ بھی تم لے لو
 تمہارے حصہ میں جام و صراحی ساغر و مینا
 مری قسمت میں ذوقِ تشنگی ہے وہ بھی تم لے لو
 بہاروں پر پٹھانوں کو دیا ذوقِ نظر اپنا
 نکا ہوں میں جو اب بھی روشنی ہے وہ بھی تم لے لو
 نشاطِ صبح کا رنگِ شفق تو تھا تمہارا ہی
 جو سُرخِ شامِ غم کی بجلی ہے وہ بھی تم لے لو
 تمہاری محفلِ عشرت میں رقصاں چاند تارے ہیں
 ہمارے گھر شبِ بھراں بسی ہے وہ بھی تم لے لو
 یہ مانا مطمئنِ آسودگی کے تہنہوں میں ہو
 مرے ہو نوٹوں پہ جو بے بس ہنسی ہے وہ بھی تم لے لو
 گریباں چاک بکھرے بالِ آنسو خشک لب سوکھے
 تمہارے غم نے جو جاگیر دی ہے وہ بھی تم لے لو
 مرے گیتوں کا ہے بیکل ترنم تم سے وابستہ
 جو ہے آنسوؤں میں رگنی ہے وہ بھی تم لے لو

سنا ہے عشق کا جذبہ بھی لاشعوری ہے
 تو پھر یہ بل کے پھڑنا ہی کیوں ضروری ہے
 دل و نگاہ میں کب سے بسا ہوا ہے کوئی
 وہ بات کیا ہے بتاؤ جو اتنی دوری ہے
 چلا تو ہوں تری یادوں کی روشنی لے کر
 سفر طویل مگر زندگی ادھوری ہے
 سنبھل سنبھل کے اٹھانا قدم کسی کے لئے
 بڑی کٹھن ہے ڈگرا دور یہ عبوری ہے
 میں تری بزم میں رہ کر بھی تجھ کو پا نہ سکا
 زمانہ کہتا ہے ہر اس میری پوری ہے

یہ مانا خاک کا پتلا ہے آدمی بیسکل
 مگر یہی کہیں ناری کہیں پہ نوری ہے



دل کے تقاضے سرگم سرگم
 دیدہ حسرت پرہیز پرہیز
 ظلم اور احسان پیہم پیہم
 اشک و تبسم باہم باہم
 دھوپ سا چہرہ محفل محفل
 چھاؤں سی زلفیں ریشم ریشم
 عارض دہلی دہلی
 نکبت گیسو مدہم مدہم
 نور تبسم اوتا اوتا
 تابش دندان پونم پونم
 شام سی چلمن نزل نزل
 چاند سا مکھڑا چم چم چم

زلف کسی کی بکھری بکھری
 نظم دو عالم برہم برہم
 مری انگاہیں مرکز مرکز
 ان کے جلوے عالم عالم
 ضبط کے سایے نشر نشر
 یاد کے شعلے مرہم مرہم
 عمر تجسس دریا دریا
 مقصد ہستی سنگم سنگم
 فرض سیاست لشکر لشکر
 عزم محبت پرچم پرچم
 ہجر کی راتیں بیکل بیکل
 وصل کی باتیں مبہم مبہم



سب پہ دیوانے کی نظر بھی نہیں
 سب سے دیوانہ بے خبر بھی نہیں
 جینے والے تو جتنی سمجھ میں
 زندگی اتنی معتبر بھی نہیں
 منظر کا عجیب عالم ہے
 اب اسے فکر منظر بھی نہیں
 مطمئن ہو گئے بہار میں یوں
 جیسے احساسِ بال و پر بھی نہیں
 داستانِ غم حیات نہ پوچھ
 مخقر بھی ہے مخقر بھی نہیں
 میری دیوانگی وہاں پہنچی
 جس جگہ کوئی ہمسفر بھی نہیں
 جسم اک گھر ہے روح کا بیکل
 دیکھئے اس کا جیسے گھر بھی نہیں



رُخِ طلب میں جہاں کوئی غم سے ہارا ہے
 تیرے خیال نے آکر وہیں پکارا ہے
 ہمارے دم سے ہے قائم جمالِ نظم جہاں
 ہمیں نے گیسوئے فطرت کو بھی سنوارا ہے
 ڈھلک پڑے تو ہے پانی مژہ پہ ہو تو گہر
 جو اشک آنکھ میں تھم جائے وہ ستارا ہے
 یہاں پہ دعویٰ تمکین و ہوش ہے باطل
 نگاہِ پیر خرابات کا اشارہ ہے
 نہ صرف چشمِ عنایت پہ جان دیتا ہوں
 ملے جو تجھ سے وہ غم بھی مجھے گوارا ہے
 کسی کی چشمِ تغافل پہ جان دیتا ہوں
 یہ غم کے ماروں کے جینے کا اک سہارا ہے



دل کو سکوں نہ آئے دعا میں اثر نہ ہو
 وہ درد دے کہ جس کی دوا عمر بھر نہ ہو
 طے کر رہا ہوں راہ صنم خانہ سر کے بل
 یہ سوچتا ہوں یہ بھی تری رہگذر نہ ہو
 شعلوں کی ہر لپٹ رگ جاں سے گزر گئی
 اے برق دیکھنا وہ کہیں میرا گھر نہ ہو
 وہ جلوہ بے حجاب سی، اس کو کیا کروں
 جی ڈر رہا ہے یہ بھی فریب نظر نہ ہو
 اب ہو چلے ہیں کچھ جگر و دل ستم پسند
 اب سعی التفات برنگ دگر نہ ہو
 اک جان آرزو ہے نگاہوں کے سامنے
 یہ عرصہ حیات کہیں مختصر نہ ہو
 بیکل نگاہ عشق میں وہ شب ہے معتبر
 دامن پہ جس کے داغِ طلوع سحر نہ ہو



یہ کوزہ ساز جنوں، لطف بیکساں کیلئے
 یہ نغمہ ہائے سکوں بزمِ مدِ شاں کیلئے
 ہمیں قرار اسی میں ہے ہم کو مت چھوڑو
 ہماری زیستِ بنی سعیِ رائیگاں کیلئے
 تمہارے دامنِ رنگیں پہ دیکھ کر آنسو
 مچل پڑے ہیں ستارے بھی کہکشاں کیلئے
 نقوشِ ضبط کا عالم سراب تھا شاید
 ابھر گئیں ہیں لکیریں مزاجِ داں کیلئے
 یہ فیضِ بادۂِ ظرفِ آشنا کا ہے بیسکل
 کہ ہم نے نشہ میں بوسے بلائے جاں کیلئے



نکلوں کا خون ابھی غیرت بہا رہا بھی ہے
 لہو کو رنگ کہو تم کو اختیار بھی ہے
 وہ جس نے ٹوٹ لیا راستے میں زاد سفر
 پہنچ سکے آج وہ منزل پہ غمگسار بھی ہے
 جنوں کے سر کوئی الزام پھر، خرد والو
 جو بنس رہا تھا وہی حسن سوگوار بھی ہے
 تمام عمر جو پھولوں سے مسکراتا تھا
 الہی خیر وہ شبنم سا اشکبار بھی ہے
 کچھ آج ایسی پلائی کسی کی آنکھوں نے
 کہ رند عالم مستی میں ہو شیار بھی ہے

عجیب جذبہ احساس ہے تصور کا
 وہ پاس بیٹھے ہیں اور اُن کا انتظار بھی ہے
 وہ میرے ذکر پہ منہ پھیر پھیر لیتے ہیں
 سنا یہی ہے کہ اس بے وفائی میں پیار بھی ہے
 ہر ایک حادثہ شوق سے گزر آیا
 کہو جنوں سے ابھی راستے میں دار بھی ہے
 ترے کرم کے سہاروں پہ لٹ گئے لیکن
 ترے کرم کے سہاروں پہ اعتبار بھی ہے
 بڑھے چلو ابھی مڑ مڑ کے دیکھنے والو
 وہ کارواں جو چلا تھا پس غبار بھی ہے
 خلوص دل ہے تو بیکل حسین ہے کردار
 اگر یہ حسن نہیں ہے تو بھول خار بھی ہے



نہ بیان کیفیت و مستی، نہ حدیث و لہراں ہے
 غم آگہی سے شاید ابھی عشق سرگراں ہے
 یہ عجیب ہے زمانہ کہ چمن سے میکدے تک
 نہ کہیں سکونِ دل ہے نہ کہیں نشاطِ جاں ہے
 نہ حرم کی آرزو ہے نہ غرض ہے بتکدے سے
 مری جستجو کا حاصل ترا سنگِ آستان ہے
 ترے لطف کی حکایت، ترے جور کا فسانہ
 وہ نصیب دشمنان ہے یہ نصیب دوستان ہے
 مری بیدلی سلامت کہ یہ حال ہے قفس میں
 نہ خیالِ بال و پر ہے، نہ طالِ اشیاں ہے
 مرے ذوقِ جستجو کو کوئی کیا سمجھ سکے گا
 کہ ہنوز کہکشاں بھی مری گرد کارواں ہے
 کبھی غم میں ہنس دیئے ہیں کبھی رو دیئے خوشی میں
 یہی زندگی ہے بیکل یہی اپنی داستان ہے



وہ کوئی جام تھا یا جامِ نسا، یاد نہیں
میرے ساتی تیری آنکھوں کے سوا، یاد نہیں

ہائے اُن مست نگاہوں کا تصادم، توبہ
گروشِ وقت کا کیا حال ہوا، یاد نہیں

میں نے طوفان میں موجوں کی بنالی کشتی

نا خدا ڈھونڈھے وہی جس کو خدا، یاد نہیں

کہہ گئی آج یہ خاموشی موجِ طوفاں

ڈوبنے والا کہاں ڈوب گیا، یاد نہیں

کچھ اجالا سا گلستاں میں ہوا ، دیکھا تھا
 کب دھواں میرے نشیمن سے اٹھا ، یاد نہیں
 وہ بھی دن تھا کہ مری تشنہ لبی پر یارو
 جھوم کے برسی تھی ساون کی گٹھا ، یاد نہیں
 شدتِ درد سے بیمار کا دل ڈب گیا
 آج کیا ہے کہ مسیحا کو دوا یاد نہیں
 آپ جو چاہیں مناسب وہ سزا دیں مجھ کو
 ایک بیکل کو کوئی اپنی خطا ، یاد نہیں

تری یاد کی داستان چھوڑ آئے
 جہاں بھی گئے اک جہاں چھوڑ آئے
 ترے بے نشاں یہ نشاں چھوڑ آئے
 غبارِ پسِ کارواں چھوڑ آئے
 جدھر سے بھی گزرے جہاں سے بھی گزرے
 محبت کی اک داستان چھوڑ آئے
 انھیں سے یہ پوچھو کہ کیا ان پر بیتی
 بہاروں میں جو گلستاں چھوڑ آئے

قفس میں بھی ذکرِ چمن کرنے والو
 بہاروں کو آخر کہاں چھوڑ آئے
 ہم اہل جنوں، خوشِ وحشت میں اکثر
 کہاں کامکاں، لامکاں چھوڑ آئے
 تری محفلِ ناز سے اٹھنے والے
 یقین لے کے آئے گماں چھوڑ آئے
 وہ بیکل ہمیں ہیں جو اپنے چمن میں
 سلگتا ہوا آشیاں چھوڑ آئے

لاہور پاکستان

مئی ۱۹۶۱ء



مرے جنوں نے کرشمہ دکھا دیا کہ نہیں
 تمہیں بھی چاک گرمیاں بنا دیا کہ نہیں
 تمہارے جلوہ رنگیں کی اک جھلک کیلئے
 متاعِ ذوقِ تماشا لٹا دیا کہ نہیں
 گماں سے اور نکھرتا گیا جمالِ یقین
 حجابِ حسنِ تمنا اٹھا دیا کہ نہیں
 تجھے خبر ہے، تو بے جور بے اماں کی قسم
 ستم نے حوصلہ دل بڑھا دیا کہ نہیں
 بہ فیضِ دیدہ پر نعم ، بنامِ سوزدروں
 کلی کلی کو گلستاں بنا دیا کہ نہیں
 میں بن گیا ہوں تماشا یہ غم نہیں مجھ کو
 یہ دیکھنا ہے کوئی مسکرا دیا کہ نہیں
 تمہیں تو ناز تھا ہوش و خرد پہ اے بیکل
 نگاہِ ناز نے بیکل بنا دیا کہ نہیں



سرورِ تشنگی میں جب بھی مینا نے چلے آئے
 سمٹ کر میکشوں کے پاس پیما نے چلے آئے
 کوئی اُس دشمنِ ہوش و خرد کو کچھ نہیں کہتا
 مجھی کو حضرت ناصح بھی سمجھانے چلے آئے
 بقدرِ جوشِ وحشت، وسعتِ صحرا نہ تھی شاید
 چمن میں خاک اڑانے کیوں یہ دیوانے چلے آئے
 یہ مانا دور کی نسبت ہے پھر بھی اک تعلق ہے
 حرمِ والوں کی یاد آئی تو بت خانے چلے آئے
 نیاز و ناز کا یہ ربطِ باہم اے معاذ اللہ
 حضورِ شمعِ خود لہرا کے پردانے چلے آئے

گماں کے تذکرے بزم یقین تک آگئے آخر
 حقیقت کے لبوں تک یوں بھی افسانے چلے آئے
 کچھ اس انداز سے فصل بہاراں اب کے آئی ہے
 سرگلشن میں تماثل بن کے دیرانے چلے آئے
 خلوص جستجو ہے شرط . منزل مل ہی جائے گی
 جہن ہوتے ہوئے دیوانے دیرانے چلے آئے
 نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے کبھی یہ واعظ ناداں
 وہ فرسودہ افسانے کو دہرانے چلے آئے
 تمنائے سکوں میں اب یہ اپنا حال ہے بیکل
 حرم میں دل جو گھبرایا تو میخانے چلے آئے



سازِ غم چھیڑ کر مطمئن ہو گئے
 جب سے پھیری نظر مطمئن ہو گئے
 دیر و کعبہ میں تسکین سجدہ کہاں
 پا کے ہم ان کا در مطمئن ہو گئے
 میرے لئے یہ اک راہبر ہی نہیں
 جتنے تھے ہم سفر مطمئن ہو گئے
 میں بھی کچھ سوچ کر چپ تھا اس بزم میں
 وہ بھی کچھ سوچ کر مطمئن ہو گئے
 صورتِ غم وہی ، حالتِ دل وہی
 کیوں مرے چارہ گر مطمئن ہو گئے
 آپ جو روتخاقل پہ نازاں تو ہیں
 اور ہم بھی اگر مطمئن ہو گئے
 ان کو بیکل : منزل کبھی مل سکی
 وہ جو اہل سفر مطمئن ہو گئے



بھلک نظاروں کی چلمن میں چھوڑ آئے ہیں
لنگاہ شوق کو الجھن میں چھوڑ آئے ہیں

ترے خیال کے سایے میں ہے جنوں محفوظ
خرد کو محفلِ دشمن میں چھوڑ آئے ہیں

فروغِ لالہ و گل کا مدار تھا جس پر
وہ روشنی بھی نشیمن میں چھوڑ آئے ہیں

اودھ کی شام ، بنارس کی صبح کا عالم
کسی حسین کے آنکھ میں چھوڑ آئے ہیں

نشاطِ منزل تسکیں انہیں مبارک ہو
 ہمیں جو حلقہٴ رہزن میں چھوڑ آئے ہیں
 جو تیرے حسنِ تبسم پہ اشک بھر لائے
 سلگتی آگ وہ ساؤن میں چھوڑ آئے ہیں
 تمہاری بزم سے اٹھ کر تمہارے دیوانے
 کبھی کبھی تمہیں الجھن میں چھوڑ آئے ہیں
 وہ چند اشک جو تھے رازِ داں غمِ دل کے
 انہیں تمہارے ہی دامن میں چھوڑ آئے ہیں
 جہاں میں پیکرِ خاک کی کوئل کہاں بیکل
 سکون ملتے ہی مدفن میں چھوڑ آئے ہیں

○
خجری بزم سے اٹھے وہ باشعور چلے
نظرِ نظریں لئے جلوہ گاہِ طور چلے

نصیب ہو نہ سکی ان کو عشرتِ منزل
جو بد نصیب ترے نقشِ پایے دور چلے

جنہیں تھا دعویٰ تمکین وہ ہوش کھو بیٹھے
رنگاہِ مست کے وہ دور رنگِ نور چلے

وہ بزمِ ناز کی رنگینیاں کہ دیدہ دران
نظر میں خلد، نفس میں لئے سرور چلے

جنہیں تھا رابطہ خاص چشمِ ساقی سے
غیر بادہ بھی وہ میکہے سے چور چلے

بقدرِ ظرفِ طلب ہے عطائے جلوہ دوست
جسے ہوتا اب نظرِ حسن کے حضور چلے

بلائیں لیتی چلے ساتھ ساتھ موجِ صبا
خرامِ ناز کا عالم کہ جیسے حور چلے

ترس گئے نگہِ لطف کے لئے بیکل
شکستہ دل تری محفل سے نا صبور چلے

رہیں اُس رہی ہے نہ مجو یا س رہی
 بچھڑ کے تجھ سے مری زیست بد جو اس رہی
 جو دند آیا تری بزم میں ہوا سیراب
 وہ تشنہ کام رہا میں کہ جسکو پیاس رہی
 تری زگاہِ کرم نے وہ گل کھلائے ہیں
 جہن میں فصل بہاراں اُداس اُداس رہی
 ہر اک لحظہ مری دھڑکنوں میں چبھتی تھی
 عجیب چیز مرے دل کے اُس پاس رہی
 مئے نشاط تری سادگی نے پھلکا دی
 زگاہِ عشق کو کیا جانے کس کی پیاس رہی



چاندنی رات میں، بات ہی بات میں، مسکرائے تو پوری غزل ہو گئی
 نیکے انگڑائیاں شاخِ گل کی طرح، لوچ کھائے تو پوری غزل ہو گئی
 دہکے دہکے سے لب، ہلکے ہلکے کنول، مہکا مہکا بدن فصلِ گل کا بدل
 بہکے بہکے نین رازِ قسمت کے حل، رنگ لائے تو پوری غزل ہو گئی
 گردشِ وقت کے آنسوؤں کو پیئے، کتنے تشنہ لبوں کی کہانی لے
 فکرِ ساقی میں یوں میکدے کے دیئے، جگمگائے تو پوری غزل ہو گئی
 تاج ہو جیسے جہنا میں اتر ا ہوا، ایک انگڑائی کا اور دھوکا ہوا
 گیت کا روح پرور یہ مکھڑا تمہی، گنگنائے تو پوری غزل ہو گئی
 دھوپ سے رخ پہ بادل سی زلفوں کے خم، اک قیامت لے نور و ظلمت بہم
 مطلعِ حسنِ تاباں کی ضو کی قسم، تم جو آئے تو پوری غزل ہو گئی
 کالی کالی گھٹا، بھیگی بھیگی فضا، مدھ لٹا ہوا بھینی بھینی ہوا
 ایسی رُت میں جو احساسِ بیکل ترے لڑکھڑائے تو پوری غزل ہو گئی



ضبط کی چھاؤں میں تکمیل غم دل ہوگی
 کیا خبر تھی کہ اسی راہ میں منزل ہوگی
 شہر کا شہر ہوا قتل تو چمچا نہ ہوا
 اب مرے قتل پہ کیا شہرت قاتل ہوگی
 ایک دن قافلہٴ مذیت گزر جائے گا
 یوں ہی رستے پہ پڑی حسرتِ منزل ہوگی
 ہم جسے تیرہ ششی کہہ کے گزر جاتے ہیں
 روشنی بن کے کہیں رونقِ محفل ہوگی
 لالہ دگل کے فسانوں کے حسیں رنگ میں بھی
 سرخیِ خونِ بہار ان کہیں شامل ہوگی
 لوگ کہتے ہیں کہ طوفاں نے ڈبویا ہوگا
 میں یہ کہتا ہوں کوئی سازش ساحل ہوگی

تہمتو آؤ کوئی پھر سرا ہمدرد ہوا
 پھر وہی بھول کھلے رنگ منازد ہوا
 زخم جو سو کو چکے تھے وہ ہرے پیر سے ہوئے
 پھر پٹری اوس زمانے پہ، جہاں سرد ہوا
 زخم تقدیر کہانی مری دہراتا ہے
 پھر لگی پوٹ کلیجے میں وہی درد ہوا
 جھڑ کر کچھ نہ ملے گا کسی بے بس کو تجھے
 کیا کریگا یہ تصور جو ترا گرد ہوا
 لوگ کہتے ہیں محبت میں شفا ہے بیکل
 کس لئے بھول سا چہرہ یہ ترا زرد ہوا

ریدنگ انگلینڈ

۱۳ اگست ۱۹۶۹ء



قرار دل سے گیا روشنی نظر سے گئی
 یہ کس کی یاد خیالوں کی رہگذر سے گئی
 فسون کیفیت میں گم ہو گئی فضا نے چین
 نگاہ کس کی یہ ٹکرا کے چشم تر سے گئی
 یہ کم ہے کیا کہ بھرم رہ گیا شب غم سما
 گل نہیں کہ دعا لذت اثر سے گئی
 نہ وہ جنون طلب ہے نہ ربطِ ناز و نیاز
 تڑپ جہیں سے کشش انکے سناٹے سے گئی
 نفس ہی خوب تھا، کیا مل گیا رہائی سے
 یہی کہ، حسرت پر دازِ بال و پر سے گئی

ہے نظم صبح بہاراں انھیں کے ہاتھوں میں
 وہ جن کی کتاب نظر جلوہ سحر سے گئی
 خوشی یہ ہے کہ سکوں مل گیا زمانے کو
 یہ غم نہیں کہ بلا غم کی میرے سر سے گئی
 فتنائیں ڈوب گئیں نکہتوں میں اے سبیل
 شمیم گیسوئے جانان جدھر جدھر سے گئی



نہ کمالِ ترکِ دنیا، نہ جلالِ بادشاہی
 مرے واسطے ہے کافی تری دی ہوئی تباہی
 مجھے یاد آنے والے تجھے چاندنی مبارک
 مرا ساتھ دے رہی ہے مرے بخت کی سیاہی
 یہ چراغ اور دامن، وہ جمال اور حلین
 یہ شعورِ معصیت ہے وہ غرورِ بے گناہی
 نہ یہ میکہ رہے گا نہ رہیں گے جام و مینا
 یہی گر ہے حالِ ساقی بطریقِ کم لگا ہی

کئی حادثے سمٹ کر مری زندہ گی میں آئے
 تری آرزو نے لیکن مری کی ہے جاں پناہی
 میں جہاں آرزو میں جہاں کھو گیا، وہیں پر
 مرے ہر نفس نے دی ہے ترے عشق کی گواہی
 نہ فریب راہبر سے نہ سلوک راہزن سے
 جہاں مطمئن ہوا ہے وہیں ٹٹ گیا ہے راہی
 جسے ذوق انکساری، نہ سنوار پائے بیٹھل
 اسے کیا بنا سکے گایہ غرور کج کلاہی



تمنّا بن گئی ہے مایہ الزام کیا ہوگا
 مگر دل ہے ابھی تک تشنہ پیغام کیا ہوگا
 وہ بے تاب تماشا ہے ہی سہی اے تابِ نظارہ
 لرزا ٹھٹھا ہے دل یہ سوچ کر انجام کیا ہوگا
 یہاں جو کچھ بھی ہے وہ پر تو احساس ہے ساقی
 بحرِ بادہ جواب گردشِ ایام کیا ہوگا
 کبھی جس کے یقین سے کائنات عشقِ روشن تھی
 وہی اب ہے اسیرِ حلقہٗ اوہام کیا ہوگا
 جنونِ شوق کا عالم ہمہ مستی سہی، لیکن
 یہ عالم بھی جوابِ شوخیِ پیغام کیا ہوگا
 چلے تو ہو مزاجِ یار کی پرستش کو اے بیکل
 مگر یہ سوچ لو اندازِ استفہام کیا ہوگا



اشکِ شبنم پہ گل کے لبوں پر ہنسی، غمِ فردی ہے جیسے خوشی کے لئے
 پھر محرومات کے بعد ہوتی ہے کیوں، حادثہ چاہیے زندگی کے لئے
 دور کرنے کو میں ظلمتِ گلستاں، تند آتش تو کمر ہی چکا آشتیاں
 اب بھی باقی ہے گرتیرگی چمن، بال و پر بھلاک دوں روشنی کے لئے
 لوں تو راہِ ترقی بھی ہموار ہے، عقل و دانش کا احساس بیدار ہے
 مگر بھی دنیا میں تخریب کا کیا گدہ، آدمی کم نہیں آدمی کے لئے
 ہر قدم اک نئی منزل جستجو، ہر نظر اک نئی جنتِ رنگ و بو
 ہر نفس اک نئی صورت آرزو، مرحلے کس قدر اجنبی کے لئے
 انجم و کھلشاں کی کسے تھی خبر، پھیلکی پھیلکی تھی تنویر شمس و قمر
 شمع سے پہلے ہم انجمن میں تری، دل جلاتے رہے روشنی کے لئے
 میں بہک ہی چلا تھا خدا کی قسم، میرے ہر سمت تھا حسنِ دیرِ حرم
 وہ تو کہے کہ اک شمعِ میخانہ سے، راستہ مل گیا راستی کے لئے
 رنگ و بو، انجم و گل، بہار چمن، شمعِ محفل شبِ ماہ کا بانگین
 ایک بیکل کی سب زندگی کی پھین، وقف ہے اک تمہاری خوشی کے لئے



آج پھر ایسے سلیقے سے گھٹا چھائی کر بس
 پھر منائے ہے مجھے توبہ کی انگرہائی کر بس
 میں تھا مستقبل کے احساسات جلوؤں میں گم
 ذہن کو چونکا گئی ماضی کی پرواہی کر بس
 یوں تو پھولوں کی سنہری زندگی پر ناز تھا
 اک کلی اس حادثے پر ایسی مسکائی کر بس
 یہ گل و لالہ رو پہلی شام، دریا کا بہاؤ
 ایسے میں بھولی ہوئی اک شکل یاد آئی کر بس
 بے بسی کفنار ہی ہے پھر تمناؤں کی لاش
 پھر کوئی بیدار دہکائے ہے شہنائی کر بس
 آج کیوں جلنے کسی کی بزم میں دیوانے کو
 گردشِ ایام پر اتنی ہنسی آئی کر بس



رات پھر مافخ بلا نوشوں کو سمجھانے گئے
 میکدے سے نکلے تو مشکل سے پہچانے گئے
 راہ میں بھٹکی جو فصل گل تو پہو پچانے گئے
 اس بہانے سے چمن کی چھ میں دیرانے گئے
 کیا کیا ساتی نے رندوں سے چھٹی منہ کی لگی
 ہاتھ سے زاہد کے بھی تسبیح کے دانے گئے
 لٹ لٹا کر ہردانِ منزل دیر و حرم
 کیا کہا جائے کہ کس عالم میں میخانے گئے

سازش تیرہ شبی ہے یا کہ جلوؤں کا فریب
 شمع تک پہنچے تو اپنی جاں سے پروانے گئے
 پھر ہر اک چلن اٹھے ہر پہلو روشن ہوں چرخ
 اُن اندھیروں سے نہ جانے کب کے دایوانے گئے
 روز جو شبنم چھڑکتے تھے شپین پر مرے
 دیکھنا یاد کدھر وہ آگ برسانے گئے
 اب تو ہر منزل پہ ایسوں ہی کا ہے لطف و کرم
 گردش دوراں بتا کس سمت بیگانے گئے
 ڈھونڈھتی ہی رہ گئیں عنوان خود رسوائیاں
 اُن اچھوتے ہونٹوں تک بیکل کے افسانے گئے



محبت کو روپ ترنم کو جوانی کہیے
لب و رخسار کو الفاظ و معانی کہیے

چشم بے باریں "رسلین" کے دوہے کا سر
ایسے عارض کہ کسی سنت کی بانی کہیے

خاشی کرشن کی بنسی کے الاپوں کا سکوت
گفتگو ایسی کہ جہنا کی رودانی کہیے

ہر ادا حسن مجسم ہے کہ حافظ کی غزل
وہ سراپا ہے کہ تحنیلِ قسانی کہیے

چہرہ گل کو شفق چوم کے مانگے ہے لہو
کیوں اسے جشن بہاراں کی نشانی کہیے

آپ اس طرح نہ چہرہ پہ بکھیریں گیسو
دن ڈھلا، شام ہوئی، کوئی کہانی کہیے

قید یہ ہے کہ سبز زم رہیں ہونٹ سیلے
حکم یہ ہے کہ ہر اک بات زبانی کہیے

قاصی شہر کے فتوے میں یہی ہے تاکید
”آج سے بادہ گل رنگ کو پانی کیے“

آج پھر شوکت معراج جنوں نکھری ہے
کیوں نہ پیکار شب حیراں کو سہانی کہیے

شہرِ تاحمرا چٹانوں پر گل افشائی ہوئی
 پتھروں پر جب سے شیشوں کی نگہبانی ہوئی
 اس طرح نظریں میں دنیا کو حیرانی ہوئی
 چوک کچھ ہم سے ہوئی کچھ اُن سے نادانی ہوئی
 ہنس رہی ہے آج تک دنیا ہمارے حال پر
 کہہ کے رازِ دل ہمیں کتنی پشیمانی ہوئی
 آئینہ حیراں تھا کل ان کے سنو جانے کے بعد
 آج ہر چہرے کو آئینے پہ حیرانی ہوئی
 پھر بہاروں سے بغاوت کا زمانہ آگیا
 پھر گلوں پر بارِ قید چاک دامانی ہوئی
 پھر ہوا کرلوں کا کاروبار مہر و ماہ میں
 پھر چراغوں کو چراغوں سے پریشانی ہوئی
 جام لٹے، تشنہ کامی لٹ گئی، تمبیں بھیں
 آگ جب اتنی لگی تب جا کے مئے پانی ہوئی

مشکلیں عیش و طرب کی تھیں تو گورا ذہن تھا
 زندگی کو غم نے انواسا تو آسانی ہوئی
 موت کہتے ہیں جسے سب اصطلاح عام ہیں
 وہ بلائے زندگی ہے میری پہچانی ہوئی
 جھگلا کر کہہ اٹھے شہر خموشاں کے چراغ
 جتنی آبادی بڑھی اتنی ہی ویرانی ہوئی
 اے فصیح وقت اے اہل تلفظ ہوشیار
 مہربانی عام ہو کر اب مہربانی ہوئی

.....



شمعِ صد جلوه نہیں رونقِ محفلِ تنہا
کتنی شمعوں کو جلانے ہے مرادِ تنہا

کارواں چھوٹ گیا رات کے سنائے میں
رہ گئی ساتھ مرے حسرتِ منزلِ تنہا

عزمِ محکم ہو تو ہوتی ہیں بلائیں پر سپا
کتنے طوفانِ پلٹ دیتا ہے ساحلِ تنہا

میری پلکوں نے شبِ غم وہ لٹائے موتی
پتھرِ خیرہ نہ سکا اک مہِ کاملِ تنہا

حُسنِ ہنگامہ بازار میں مصروف رہا
عشقِ چپ چاپ بھلے رہا محفلِ تنہا

سب کے ہونٹوں پہ تبسم تھا مرے قتل کے بعد
جانے کیا سوچ کے روتا رہا قاتلِ تنہا

ہجر کی رات بھی دشوار تھی اے بیکل
اور پھر حسنِ تصور رہا مشکلِ تنہا

یوں تو رہنے کو ہر اک آنکھ کے تارے رہے
 ہاں مگر آپ بہر حال ہمارے رہے
 فرق مٹ جائے گا مجبوری و مختاری کا
 زندگی جیت کے ہر سانس پہ ہمارے رہے
 کہکشاں اور ابھی جشنِ چراغاں کر لے
 اپنی زلفوں کو ذرا دیر سنوارے رہے
 یوں ہی بس ملتی رہے وقت کے ماروں کو پناہ
 یوں ہی بس باہنیں حوادث کی پسارے رہے

کب سے بیدار ہیں حالات زمانے کے مگر
 دھڑکنیں سونے لگیں ان کو پکارے رہے
 مسئلے دیر و حرم کے ابھی سلجھا دیں گے
 گردشِ وقت کو شیشے میں اتارے رہے
 جلوۂ صبحِ نظربین کے تماشا دیکھے
 بس اسی طرح شفقِ رنگِ نظارے رہے
 آپ اور یہ لبِ دریا پہ سلگتے نغمے
 آگ لگ جائے نہ پانی میں کنارے رہے

وقت پر آگ بھی گلزار ہوئی ہے بیکل
 آپ یوں جذبۂ احساس ابھارے رہے

بشکریہ آکاش وانی

زلفِ جاناں کی پریشان کہانی تو رہے
 زندگی رات ہی رات سہانی تو رہے
 خلدِ چوٹکوں دوزخ کو بچا دوں لیکن
 اگ اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں پانی تو رہے

وقت وہ ہے کہ ہر اک حسن یہی چاہتا ہے
 کچھ حقیقت نہ رہے میری کہانی تو رہے
 دوستوں کی بھری دنیا میں سکوں کی خاطر
 کم سے کم کوئی مراد دشمن جانی تو رہے
 راکھ رہنے دو دشمن کی ابھی گلشن ہیں
 کچھ نہ کچھ جشن بہاراں کی نشانی تو رہے



تم جو کہتے ہو اندھیروں کو سنوارا جائے
 پھر بتاؤ کہ کہاں وقت گزارا جائے
 اب تو بستی کا ہر اک شخص ہے عیسیٰ کی طرح
 کیوں نہ رستہ کسی قاتل کا ہمارا جائے
 جس زمانے میں ملی راہ کو منزل سے نجات
 آؤ اس دور کے لوگوں کو پکارا جائے
 اب اندھیروں کو مرے گھر میں سکون ملنا ہے
 میرے آنگن میں نہ سورج کو اتارا جائے
 اپنی کشتی کا محافظ تو بہر حال ہوں میں
 کا ہے طوفاں میں مرے ساتھ کنارہ جائے
 آج اک بھیڑ سہرا ہے دیوانوں کی
 دیکھئے کہ کسکی طرف اس کا اشارہ جائے
 جس نے پھولوں سے سنوارا ہے چٹانوں کا مزاج
 ایسے دیوانے کو پتھر سے نہ مارا جائے

چلیے ہم جیسے فقیروں کے نگر میں رہیے
 وقت رہزن ہے اکیلے نہ سفر میں رہیے
 جلوہ شام میں یا نور سحر میں رہیے
 رات اندھیری ہے نہ اجڑے ہوئے گھر میں رہیے
 ہم تو دھرتی کے اندھیروں میں بسر کریں گے
 جائیے آپ کہیں شمش و قمر میں رہیے
 اب چٹانوں کی تھیلی پہ کنول کھلتے ہیں
 اب تو شبِ نیم بھی کہے کہ شر میں رہیے
 سنگبیزوں کے مقدر کو پرکھنے کے لئے
 چند دن انجمنِ نعل و گہر میں رہیے

یوں تو ہر بات میں ہیں آپ فرشتوں کی طرح
 آئینہ دیکھے ہے اندازِ بشر میں رہیے
 آپ تو سہتے ہیں دنیا کی نگاہوں میں مگر
 اک ذرا دیر خود اپنی ہی نظر میں رہیے
 ڈوبنے والوں سے طوفاں کو بچایا ہے مگر
 وقت کہتا ہے ابھی اور بھنور میں رہیے
 عمر کچھ شدتِ احساس کی بڑھ جائے گی
 آئیے آپ مرے دیدہ تر میں رہیے
 منصفوں کا یہ زمانہ ہے کہاں جابیے گا
 اب تو بیکل کسی قاتل کے اثر میں رہیے

نظر کی فتح کبھی قلب کی شکست لگے
 مری حیات پرانے کا بند و بست لگے
 نہ وہ نقوش نہ حسن کشش کی بات رہی
 صنم فروش بھی جیسے خدا پرست لگے
 ابھی ملا تھا ابھی پھر پھڑ گیا کوئی
 یہ حادثہ بھی حکایات بود و ہست لگے
 فرشتے دیکھ رہے ہیں زمین و چرخ کا ربط
 یہ فاصلہ بھی تو انساں کی ایک جست لگے
 وہاں سفینے کو پہونچا دیا ہے طوفاں نے
 ہر ایک موج بلا اب جہاں سے پست لگے
 ترے ہی غم نے کسی سمت دیکھنے نہ دیا
 کہ اب ہجوم تمنا بھی تنگ دست لگے
 جو تیری بزم سے بیکل چلا تو ہوش میں تھا
 عجیب بات ہے اب وہ بھی مست مست لگے

غیروں کی آستیں کا نہ خنجر پخوڑیے

بولے کا خون اپنوں کا نشتر پخوڑیے

مہر کی بھوک میں تو اگائے ہیں چاند تک

پیاسی ہے بوند بوند سمند پخوڑیے

کچھ تشوہ نہ جائے ارادہ بہار کا

شعلوں میں اور تھوٹا گل تر پخوڑیے

منصف کا فیصلہ بھی ہے قاتل کے ہاتھ میں

پھر قتل ہو کے عدل کا دفتر پخوڑیے

یہ دور فکر و فن ہے تو شیشے کے قاب میں

بیباکیوں کے ہاتھ سے پتھر پخوڑیے

شاید بھی ہو اس میں امیروں کی آبرو

یوں ہی نہ ہر غریب کی چادر پخوڑیے

بیکل جو جی رہی ہو چھاغوں کی چھاؤں میں

اُس تیرگی میں کیوں مہ داختر پخوڑیے

طنز کی تیغ بھی پر سبھی کھینچے ہوں گے
 آپ جب اور مرے اور نیچے ہوں گے
 آئینہ پوچھے گا جب رات کہاں تھے صاحب
 اپنی بانہوں میں وہ اپنے ہی کو بھیجے ہوں گے
 جس طرف چاہئے گا آپ چلے جائیے گا
 سامنے چاند کے ہم آنکھوں کو میچے ہوں گے
 آج پھر گزریں گے قاتل کی گلی سے ہم لوگ
 آج پھر بندرکانوں کے دریچے ہوں گے
 جس کی ہر شاخ پہ رادھائیں مچلتی ہوں گی
 دیکھنا کرشن اسی پیڑ کے نیچے ہوں گے
 اک مکاں اور بھی ہے شنیش محل کے لوگو
 جس میں دہلیز : آنگن : درتکے ہوں گے
 تیرا دم ہے تو بہاروں کو سکوں ہے بیکل
 پھر ترے بعد کہاں باغ بیگچے ہوں گے

مجھے نہ دیکھو، تو میرا شعورِ غم دیکھو نہ
 جو ہو سکے تو کچھ اپنی حد ستم دیکھو
 میں ایک شاعرِ فطرت تو ایک حسنِ نموش
 تم اپنے عکس سے پہلے مرا قلم دیکھو

قطرہ

○
 ایک سی ہو گی کبھی دور کبھی پاس کی آگ
 پھونک ڈالے نہ کہیں شدتِ احساس کی آگ
 پیرہن شعلوں کا سب غچہ و گل نے پہنا
 لگ گئی سارے چمن زار میں مدھماکے کی آگ

○
 بہت اچھا کیا اپنوں نے رسوا کر دیا مجھ کو
 وگرنہ دشمنوں کا یہ بھی اک ارمان رہ جاتا
 جو اپنے شہرِ دالے گالیاں نہ مجھ کو دے لیتے
 تو میرے حاسدوں کا مجھ پر یہ احسان رہ جاتا

○
 تھپڑے کیوں پریشاں ہے بختور میں
 ہوا کے ساتھ اٹھ ساحل پہ آجا
 پھٹنے والے سے کہہ دے یہ کوئی
 "کسی بھی راہ سے منزل پہ آجا"

○
 ابھی ٹھہر جا پیسے تو نغمہ یار نہ ہو
 دل حزیں تو ابھی مائل بہار نہ ہو
 ابھی کسی کے تصور میں دو جہاں گم ہے
 خدا کرے کہ فسانے کا اختصار نہ ہو

○
 مشکلیں زلیت کی آسان وہاں تک ہوں گی
 سرحدیں عقل کی محدود جہاں تک ہوں گی
 طائر ہوش کی اسے جرأت پرواز سنبھل
 بے پری کی یہ شکایات کہاں تک ہوں گی

○
 کشتیاں غرق ہوئیں، شورش ساحل تو نہیں
 کارواں لٹ بھی گیا، راحتِ منزل تو نہیں
 ظرفِ پستی میں بلند ہی کا سمونا ہی ہے
 بات کچھ بھی ہو مگر ظرف کا حاصل تو نہیں

○
 سکونِ قلب کی منزل کو ڈھونڈھنے والے
 ابھی تو راہِ وفا سے گزر رہا ہے تو
 سوادِ منزلِ تسلیم دور ہے بیٹکل
 نگاہِ ناز کے فتنوں سے ڈر رہا ہے تو

○
 جب کبھی تو قریب ہوتا ہے
 اک زمانہ رقیب ہوتا ہے
 تجھ کو پا کر میں خود کو یاد رکھوں
 دقت یہ کم نصیب ہوتا ہے



تو مل جاتا ہے ، مل جاتی ہیں ساری نعمتیں
 تو نہیں ملتا ہے تو ہے انتظارِ زندگی
 زندگی کیا ہے ، سنا ہے کیفیاتِ موت ہے
 موت کو سمجھا تو پھر پایا خسارِ زندگی



بہارِ آئی ہے گلشن میں زندگی بن کر
 کہ جیسے شہرِ خموشاں کی روشنی بن کر
 فریب کھائے ہزاروں مگر تجھے اے دوست
 مری نگاہوں نے دیکھا ہے خامشی بن کر



حسین چاند ستارے یہ رات کے گیسو
 کسی فریب میں کھوئی ہوئی نظر تو نہیں
 حیات نور ہیں یہ تازگی اے توبہ
 یہ سحر ہو گا کسی ذات کا، سحر تو نہیں



عزم کو میرے سر نزم پکارا تو نے
جذبہ شوق مرا آج ابھارا تو نے
چشم بیباک ترے ضبط تکلم کی قسم
ایک سیکل کو بٹے داؤں سے مارا تو نے



اے صبا گیسوے شبنگوں کو بکھر جانے دے
چاندنی اور گھٹاؤں میں ٹکھر جانے دے
جلوہ ناز ابھی چھیڑ نہ آئیے کوڑ
اور ابھی حسن کے عالم کو سنور جانے دے



پہوانے یہ چلے ، وہ چلے ، خاک ہو گئے
دیوانے جیسے صاحب ادراک ہو گئے
الزام مری جرأت بیباک کو نہ دو
کچھ ان دنوں تمہیں ذرا بیباک ہو گئے



پروانہ آج شمع کے پہلو میں جل گیا
 اک عشق تھا جو حسن کے سانچے میں ڈھل گیا
 سوچا تھا آج اُن کو بتادوں گا دل کی بات
 وہ سامنے جب آئے تو جادو سا چل گیا



لذتِ فصلِ بہاراں کے ہوس میں کچھ لوگ
 آشیاں پھونک دیئے حسن چمن بھول گئے
 عرش پر کاوش پرواز الہی تو بہ
 آدمی فرش پر خود اپنا چلن بھول گئے

کہیں یہ کالی گھٹا اٹھ کے جام روک نہ لے
 یہ دور آج کوئی تشنہ کام روک نہ لے
 کسی خیال میں اس گزشتہ زمانہ کو
 گمان ہے کوئی نازک خرام روک نہ لے

جو بڑھ کے جام دیا، تھر تھرا اٹھاساتی
 جو پی کے رند چلے لڑکھڑا اٹھاساتی
 گھٹائیں جھوم کے برسیں کہ رات بھیگ چلی
 سرور اور بڑھا، مسکرا اٹھاساتی

شعور پوش و خرد ہی کی لاج رکھنی تھی
 وگرنہ تشنہ لبی ہی سے کام لے لیتے
 خبر نہ تھی کہ یہاں بھی حرام ہے پینا
 الہی پیتے ہی ہم ترا نام لے لیتے

اٹھو کہ جام و سبوحے دھواں نکلتا ہے
 بڑھو کہ آگ لگی ہے شراب خانے میں
 ذرا اٹھو کہ کسی رندے فروش کے ہاتھ
 لپکے آگ یہ لگ جائے نہ زمانے میں

کیا کالی گھٹاؤں کا فسوں مان لیا ہے
 کیا زلف یہ فام نے ایمان لیا ہے
 زاہد کو پہرہات گئے بزم طرب میں
 اک رندِ برانوش نے پہچان لیا ہے

تذکرہ زاہدِ دوراں نے کیا پینے کا
 واقعہ جیسے سناتی ہو اجل جینے کا
 یہ گہاں ہے کہ زمانے میں کوئی اور نہیں
 خوب دعویٰ ہے ترے ہاتھ میں آئینے کا

اشتعال



سوچ سے آنا گردشِ دوراں سامنے مجھ دیوانے کے
 نام پہ اُن کے آپنچ نہ آئے شرط یہ پہلے ٹھانی جائے
 بال پریشاں، اتر اچہرہ، آنکھیں ویراں، سوکھے ہونٹ
 آج جنوں گزرا ہے ادھر سے، لوگ کہیں سیلابی جائے
 پریت میں بیکل لاکھ جتن ہو دل کب اپنا ہوتا ہے
 وہ بھی اپنے، دل بھی اپنا، بات یہ کیسے مانی جائے



نچنے وگل سے شعلے پھوٹے، خاک اڑی "گلدانوں" سے
 فصل بہاراں پوچھ رہی ہے حالِ چین ویرانوں سے
 وہ کیا جانیں حسنِ چین کا وہ کیا سمجھیں راز بہار
 نکھٹ گُل جو تول رہے ہیں کلیوں کی مسکانوں سے
 کیا جانے کیا حال ہو یا ر وکل آسودہ لوگوں کا
 آج زمانہ کھیں رہا ہے مفلس کے ارمانوں سے

دستِ مایوس میں آئینہٴ آلام نہ دو
مجھ کو دیوانہ کہو اور کوئی نام نہ دو
رند نشے میں ہے نشہ سے نکھرتا ہے ضمیر
ہوش اُجائے گا لشرِ بسے جام نہ دو
دل دیا، دل کو ترپنے کی ادا بھی دیدی
پھر اُسے دردِ غم، ہجر کا انعام نہ دو
جشنِ خاموشیِ بی صبح کو ہو گا یسکن
دعوتِ نغمہٴ نظاروں کو سرِ شام نہ دو

موت جب خاص طریقہ سے گلے ملتی ہے
 زیست کو یوں کوئی آماج گہ عام نہ دو
 اے ہوا دمرے گلشن پہ جو گزری ہو کہو
 کیا ہوا دمرے نشیمن کا یہ پیغام نہ دو
 اس طرح لطف و نوازش سے نہ مرے کہیں
 ایک پروردہ تکلیف کو آرام نہ دو
 جو بھی چاہو وہ سزا دو یہ تمہاری مرضی
 بے گناہی کا مگر اب مجھے الزام نہ دو
 ایک سیکل کو تو مغرور سمجھ کر کو سو
 اپنے احساس کو یوں طعنہ دوہام نہ دو

لندن

۸ اگست ۱۹۶۹ء

سونے کی دھرتی پر پھیلی چاندی کی آبادی ہے
 انگاروں کے تخت پہ جیسے پھولوں کی شہزادی ہے
 لاکھ قفس میں صحن چمن کی ہر تصویر سجادی ہے
 موسمِ غل میں اب کے برس یہ کتنی حسین عیتادی ہے
 عیش و طرب میں لاکھ تھیلے رنج و الم میں تنہا ہیں
 ہم کو اطمینان بہت ہے لوگ کہیں بربادی ہے
 تیرے نگو کے ہر کوچے میں پھیلی ہے انصاف کی بو
 کاغذ کی پوشاک پہن کر ہر قاتل فریادی ہے

نما مکمل

اب شہر میں ہمارے بلائیں بکھیر دو
 ہم مرچیں تو اپنی دعائیں بکھیر دو
 وہ دھوپ ہے کہ روپ یہ ہمتی نہیں نظر
 پانی برس چکا ہے گھٹائیں بکھیر دو
 دم گھٹ رہا ہے وقت کا کمرے میں سیر سائف
 موسم کی کھڑکیوں سے ہوائیں بکھیر دو
 محسوس ہو رہا ہے شفا یاب ہو گئے
 جو نیز پہ دھری ہیں دوائیں بکھیر دو
 موج رواں ہے آج کے انسان کا مزاج
 دائیں بکھیر دو اسے بائیں بکھیر دو
 ہم نے سمیٹ رکھا ہے ماحول کا سکوت
 ماحول میں ہماری صدائیں بکھیر دو

ڈربن (ساؤتھ افریقہ)

۱۹۷۵ء

یوں تو تمہارے شہر میں سب ٹھاٹھاٹ ہے
لیکن کسی حسین کی طبیعت اُچاٹ ہے

جھانکونہ مجھ میں، میں کہ نہ مہرانہ گلستاں
میں بکراں ہوں مجھ میں کوئی گھرنہ گھاٹ ہے

گلشن میں رنگ و نور، خس و خوار کی ہے بھڑ
صحرا تکلفات کے فن میں سپاٹ ہے

یہ حُسنِ مصلحت ہے کہ اپنی زباں نہ کھول
یوں بھی تری خموش نگاہی میں کاٹ ہے

سب تحت و تاج وقت کے دھابے ہیں بہہ گئے
 ابھی ہوئی غریب کی بھی ٹوٹی کھاٹ ہے

ہر بھول رنگ و بو میں ہمیں کاغذی لگا
 کہتے ہیں لوگ جشن بہاراں یاد ہے

یہ حسن یہ جوانی یہ انداز یہ نکھار
 اترے ندی تو کوئی کہے کتنا پاٹ ہے

صدیوں سے دھوپ کو تو رہا چھاؤں سے عناد
 لیکن ادھر سنا ہے بڑی سانٹھ گانٹھ ہے

بیکل کہاں تو سمت غزل سرِ ختم چلا
 گیتوں کے راج کاج کا تو سامراٹ ہے

جو ہانس برگ (ساؤتھ افریقہ)

کہہ دو کہ رنگ و بو سے ہوا میں دھنوکریں
 پھر میرے گلستاں کی کوئی گھنٹو کریں
 وہ وقت ہے کہ اپنی خبر ہی نہیں ہمیں
 تو ہی بتا کہ کیسے تری آرزو کریں
 اے موسم بہار ترے احترام میں
 گلشن سنوار لیں کہ گریباں دفو کریں
 جن کے لہو سے پانی چٹانوں نے آبرو
 اُن پہ یہ قید ہے کہ غم رنگ و بو کریں
 دیو حرم میں بحث چھڑی پھر بنام امن
 پھر آؤ اہتمام شراب و سبو کریں
 منصف مجھے سزا کہ جزا دیں مرا نصیب
 جو فیصلہ کریں وہ ترے رد و رد کریں
 بیکل یہ میکہ بھی فرشتوں کی بزم ہے
 اب آدمی کی اور کہاں جستجو کریں

بشکریہ: نئی ڈی۔ نئی دلی کشمیری گیت

۱۹۷۵ء

یہ جو میرے قریب ہیں چہرے
 کیا سچی بد نصیب ہیں چہرے
 ان پہ دولت کا رنگ و روغن ہے
 پھر بھی جیسے غریب ہیں چہرے
 لوگ کہتے ہیں بے وفا جن کو
 وہ مرے ہی حبیب ہیں چہرے
 کل جو ہر حال میں رفیق رہے
 آج وہ بھی رقیب ہیں چہرے
 ہر شکن میں اداسیاں ہیں مگر
 عہدِ نو کے نصیب ہیں چہرے
 دھوپ میں لہلہانے لگتے ہیں
 دیکھو کتنے عجیب ہیں چہرے
 بے زباں رات کے اندھیروں میں
 چاندنی کے خطیب ہیں چہرے
 لوگ مانوس ہو گئے بیکل
 پھر بھی جیسے مہیب ہیں چہرے

غزل

"نذر خسرو"

دن ہے سہانا چھیل چھیل رات بڑی البیلی ہے
لیکن تجو بن یہ موسم بھی جیسے ٹٹگوں کی حویلی ہے

دودھ ہے تو ہر اک لمحہ بیتی صدی سا لگتا عطا
پاس ہوئے تو ہر اک دھڑکن جیسے دلہن نویلی ہے

کچی نیند جگا جاتی ہے رات میں سادون بھادوں کی
اتھڑ چوٹوں کی پروائی کتنی شوخ اہیلی ہے

قتل جہاں کچھ پھول ہوئے تھے آگ لگی شعلے چلے تھے
ہر پتہ اس شاخ کا اب تو مہندی لگی ہتھیلی ہے

کون ہے کس کا بیت نہ پوچھو یہ بھی جلّت کی ریت نہ پوچھو
اپنوں سے پردہ ہے لیکن غیروں سے اٹھکھیلی ہے

ان دونوں کی ایک ہی ماں ہے دو قالب میں ایک ہی جاکے
پھر بھی اردو کو ہندی کی لوگ کہیں سوتیلی ہے

میری زبان ہر دل کی زبان ہے کوئل کو مل حسن بیان ہے
برسور تک یہ تو خسرو کی انگنائی میں کھیلی ہے

اسکا لہجہ چنچل چنچل روپ کا درپن جیوت کی جھل جھل
میری غزل کی بحر نہ دیکھو یہ تو میر کی چیلی ہے

آگئیں یاد کٹھن کی بتیاں برسے نین دھڑک گئیں چھتیاں
پر ویسی اب بھیج دے پتیاں برہن آج اکیلی ہے

ہر پہلو اک زخم اُگائے ہر کردٹ مرہم بن جائے
بیکل بوجھ سکو تو جیسے یاد بھی ایک پہیلی ہے

یوں ہی کیا کل بھی مرے گھر میں اندھرا ہو گا
 رات کے بعد سنا ہے کہ سویرا ہو گا
 آج جو لمحہ ملے پیار کی باتیں کرے
 وقت بے رحم ہے کل تیرا نہ میرا ہو گا
 میں تو ٹٹ جاؤں گا لیکن مرے ٹٹ جانے کے بعد
 خود ہی ٹٹ جانے کو بے تاب لیٹرا ہو گا
 یا کوئی سوہنی مہیوال سے روٹھی ہو گی
 یا کوئی ڈوبنے والوں میں پھیرا ہو گا
 حادثے تھکے سر راہ کہیں ٹھہر گئے
 زندگی بول کہاں اب ترا ڈیرا ہو گا
 لطفِ غم دے کے چلا ہے تو چلا جا جو گی
 یہ بتا دے کہ ادھر کب ترا پھیرا ہو گا
 لوگ جس گاؤں میں منصف کو بسا آئے ہیں
 کل اسی گاؤں میں قاتل کا بسیرا ہو گا
 ناگنیں وقت کی ڈس لیں گی سنا ہے بیکل
 مطمئن جب ترے گیتوں کا سپیرا ہو گا

پورٹ ٹونس، مارشش